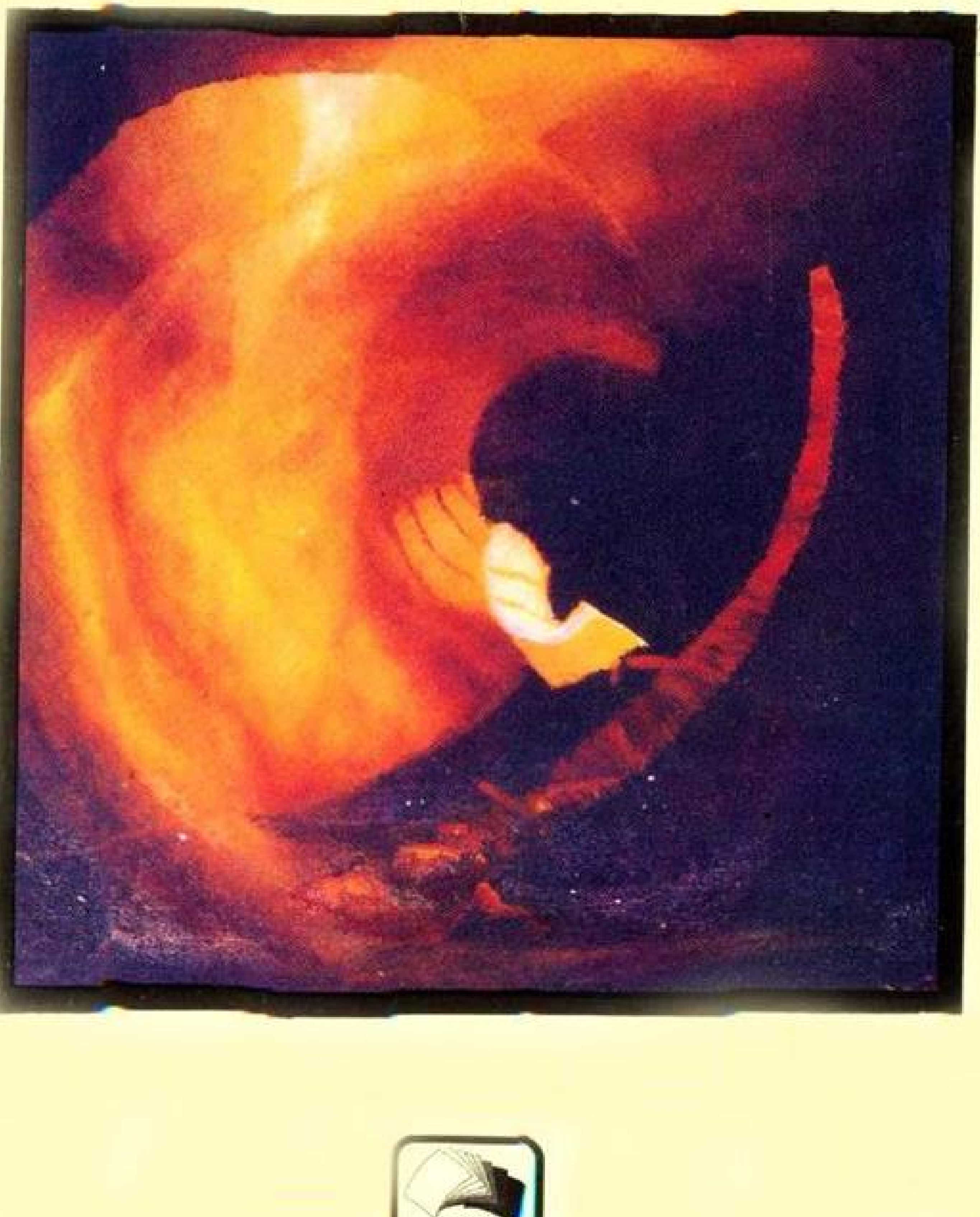
آخری دن سے پہلے

ابرار احمد



GORA PUBLISHERS

ہر نئی آواز اس لیے نئی نہیں ہوتی کہ اس میں شامل لفظ نئے ہوتے ہیں یا لہجہ نیا ہوتا ہے یا گفتگو کا انداز قدرے نامانوس ہوتا ہے۔ نیا پن ایک عجیب شے ہے جس سے دل میں سُرور اور جس کے ساتھ تعارف سے خوشی پیدا ہوتی ہے۔ ان حوالوں سے آواز کے نئے ہونے کو پہچانا جا سکتا ہے

میں نے ابرار احمد کی نظموں میں ان کے عہد اور انکی نسل کا نیا پن پایا ہے اور آواز کی ایک ایسی مہک محسوس کی ہے جو پہلے سننے میں نہیں آئی اور لفظوں کے اندر جو شاعری مخفی ہے وہ بھی بہت کم لکھنے والوں کے حصے میں آئی ہے۔

نئی آواز کا نیا ہونا۔ ایک نئی تازگی کے سبب بھی ممکن ہوتا ہے اور تازگی کے بغیر کوئی شاعر اپنے آپ کو نیا شاعر یا ایک نئی آواز کے ساتھ منسوب نہیں کر سکتا۔ ابرار احمد کی نظموں میں انسانی سرشت ایک نیا زائچہ تحریر کرتی ہے جسے اُردو شاعری کے مستقبل کے لیے ایک نیک فال گردانا جا سکتا ہے۔

شعری کائنات کی تشکیل کے لیے جو حسن انگیز نگاہ، صدا اور آواز، دل کی دبی دبی چاپ، ابرار احمد نے اپنی نظموں میں دریافت کی ہے وہ ہمارے عہد کے قلب و نظر کے لیے ایک گراں قدر تحفہ ہے جس کی تقلید و تعریف سے اُردو شاعری کا ایک نیا باب تحریر کیا جا سکتا ہے۔

جیلانی کامران

لاہور

۹ فروری ۱۹۹۷ء

اُردو میں موضوعاتی نظم کی روایت نظیرؔ سے شروع ہوتی ہے۔ نظیرؔ کے بعد تقریباً ایک سو سال کا دَور ایک ایسا تجرباتی دَور ہے جس میں اس روایت سے ہٹ کر نئی راہیں دریافت کرنے کی کوششیں نظر آتی ہیں۔ راشدؔ، میراجیؔ اور انکے عہد کے دیگر شعرا اس اعتبار سے خوش قسمت تھے کہ انھوں نے نہ صرف اُردو نظم میں ہیئتی اور موضوعاتی سطح پر تجربے کیے بلکہ انھیں اپنے اور اپنے پیشروؤں کے تجربات کی فصل کاٹنے کا بھی موقع ملا۔ تجربے کی اہمیت اپنی جگہ پر ہے لیکن خوش بختی صرف انکے حصّے میں آتی ہے جو تجربوں کے انبار سے مستقل ہیئتیں دریافت کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ راشدؔ کے عہد کے شعرا کی خوش بختی کا سبب اُس عہد میں مشرق و مغرب کی شاعری کا ایک "کُل" (WHOLE) کی تلاش کا تجربہ بنتا ہے۔ ایسا تجربہ جو محض تجربہ نہیں رہا بلکہ آنے والے دور کے لیے ایک مستقل ہیئت کی شکل اختیار کر گیا اور موجودہ نظم کی جو عمارت ہمیں آج دکھائی دیتی ہے اسکی بنیادیں انھیں شعراء کی اُٹھائی ہوئی ہیں۔ بعد میں آنے والے شعرا نے نظم میں تجربات کے انبار لگا دیے۔ صنعتی دَور میں انسانی معاشرے پر مشین کی گرفت نے جس انسانی مزاج کو جنم دیا، ان شعرا نے اپنی نظم میں اُس انسانی مزاج کو دریافت کرنے کی کوشش کی۔ ان تجربات میں ساٹھ کی دہائی کی نئی نظم کی تحریک اور اس کے متوازی دوسرے شعرا کی انفرادی کوششیں بھی نظر آتی ہیں۔ تجربے کی اہمیت اپنی جگہ، لیکن ان شعرا نے "روحِ عصر" سے اُردو نظم کا دامن بھرنے کی کوشش میں مشرقی روایت سے اس کی جڑیں کاٹنے کی بھرپور سعی بھی کی۔

نظم گو شعرا کی موجودہ نسل، جس کا کام گزشتہ دو دہائیوں پر محیط ہے، اس اعتبار سے خوش قسمت ہے کہ اس کے سامنے گزشتہ نسلوں کی کامرانیاں اور ناکامیاں دونوں موجود ہیں، اور اس نسل میں سے چند شعرا اس اعتبار سے مزید خوش قسمت ہیں کہ انھوں نے گزشتہ نسلوں کے تجربات کی فصل کاٹنے کا کامیاب تجربہ بھی کیا ہے۔ جو کمال "تاریخی جبر" نے انھیں عطا کیا ہے وہ اس کمال کے علاوہ ہے جو یہ شعرا اپنی "ذات" کی سطح پر بھی رکھتے ہیں اور اس کا سبب نظم کے دامن میں استقلال پذیر ہیئتوں کی مسلسل دریافتوں کا وہ عمل ہے جو ان شعرا کے ہاں موجود نظر آتا ہے۔ ان شعرا نے مختلف شعری روایتوں سے اپنا ناتا توڑنے کی بجائے اُس "کُل" (WHOLE) میں شامل ہونے کی سعی کی ہے جس میں مشرق کی شعری روایت کے ساتھ ساتھ دورِ حاضر کی کاسموپولیٹن شعری روایات بھی شامل ہیں۔

مذکورہ بالا دونوں کمالات نئی نسل کے جن معدودے چند شعرا کے ہاں یکجا نظر آتے ہیں ان میں ایک نام ابرار احمد کا بھی ہے اور یہ بات شاید کچھ ایسی غلط بھی نہیں کہ موجودہ نظم کے ہیئتی اور موضوعی تعین کے لیے اس شاعر کی نظم ایک معین سانچے یا پیٹرن کا درجہ اختیار کر گئی ہے۔

محمد خالد

لاہور
۱۵؍ جون ۱۹۹۶ء

آخری دن سے پہلے

ابرار احمد

گورا پبلشرز (پرائیویٹ) لمیٹڈ ۲۵- لوئر مال - لاہور

باذوق لوگوں کے لئے خوبصورت
منفرد اور معیاری کتب
پیش کرنے والا ادارہ!

ناشر : طاہر اسلم گورا

GORA PUBLISHERS

۱۹۹۷ء

بار : اوّل
سرورق : تحسین
اہتمام : افتخار احمد
قیمت : ۱۵۰ روپے

زاہد بشیر پرنٹرز - لاہور

قدیم قصبے کے نام

ہم لوٹیں گے تیری جانب
اور دیکھیں گے تیری بوڑھی اینٹوں کو

....

ہم۔ آئیں گے
تیرے مضافات میں
مٹی ہونے کے لیے

آخری دن سے پہلے

دیباچہ	(احمد جاوید)	13
تری دنیا کے نقشے میں		31
مٹی تھی کس جگہ کی		34
تم جو آتے ہو		37
آخری دن سے پہلے		40
بارش		42
ہوا ہر اک سمت بہہ رہی ہے		45

دیر لگا دی تم نے 48
ہم اک بھیس لیے پھرتے ہیں 51
موت دل سے لپٹ گئی اس شب 53
لوری سنا 55
پس منظر کی آواز 57
سرپھری ہوا 60
میں رستے کو دیکھ رہا ہوں 62
دوام وصل کا خواب 65
مجید امجد کے لیے 67
تم کہاں تک گئے 70
مٹی سے ایک مکالمہ 73
جو بھی لمس ہے 76
خواب' شبیہیں' دن 78
موجود سے پرے 80
برسوں بعد 82
زندہ آدمی سے کلام 84
کتنے بیکار ہیں دن 87
اکتائے ہوئے دوست سے 89

سمندر سے مکالمہ	92
کیسے اتروں پار	95
پچھلے پہر کی دستک	97
اجنبی کون ہو	99
ہوا جب تیز چلتی ہے	102
اور بارش ہے	105
نمناک صداؤں میں رہنے والی	107
دن گزرتے رہے	109
میں نے اس کو دیکھا تھا	112
بات کیا تجھ سے کروں	116
ہر سال کی آخری نظم	119
عرصہ خواب میں	123
لوری	126
غیر آبادیوں میں ایک نظم	128
راتوں میں	130
نہ جانے ہم کس طرح ملے تھے (انوار احمد کے نام)	132
مجھے ڈر لگتا ہے	135
دائرے ختم کہاں ہوتے ہیں	137

تھکن زدہ امانت کی واپسی	139
مجھے اچھے لگتے ہیں	141
روئی ہوئی آنکھ سے	144
تم نہیں دیکھتے	147
یادوں اور بادلوں میں	151
قصباتی لڑکوں کا گیت	154
ہمارے دکھوں کا علاج کہاں ہے	157
وہ میری راہ دیکھتی ہے	160
ہر روز	163
میں گزرتا ہوں	169
ہنوز نیند میں ہیں	172
کچھ پتا نہیں چلتا	175
نظم	178
موت مجھے بلاتی ہے	181
اگر مجھے ____	184
تم ہنستے ہو	188
نظم	191
نیندوں کے ملبے پر	194

خود کلامی (1)	197
داستان	201
صحرا پیاسے نہیں	204
خود کلامی (2)	207
وچ مرزا یار پھرے	210
ہم بے وطن ہیں	214
ہر رات سے گزرنے کے لیے	216
لمحے کا منظر نامہ	219
پیش لفظ	221

پیش لفظ

ہمارے ادب کو جدیدیت اور عصری حسیّت جیسے الفاظ کے بے دریغ استعمال نے بھی بڑا نقصان پہنچایا ہے—— شہرتِ عام اور بقائے دوام کے یہ دو ذرائع اب فارمولے کا درجہ رکھتے ہیں—— روزمرہ کے ہنگامی موضوعات کو شعر و ادب میں جوں کا توں رکھ دینا عصری حسیّت اور کسی صنف میں تکنیکی یا لسانی سطح پر گمراہیوں کو رواج دینا جدیدیت کہلاتا ہے——

یہ آپا دھاپی کا زمانہ ہے ادب تعلقات عامہ کا ذریعہ ہے اور ایک ایسے زمانے میں جب کہ قاری کی صورت مشکل سے دکھائی دیتی ہے ادیبوں کی بھیڑ میں روز افزوں اضافہ کیا حیران کن نہیں؟ حالیہ برسوں میں کتنے ہی نو آموز شاعر صاحب دیوان ہوئے—— بلکہ کئی ایک تو صاحب کلیات بھی ہو گئے—— یہ کیا ہوا؟ شعر و ادب سے سنجیدگی کیوں رخصت ہو گئی—— اور اب کھوٹے کھرے کی شناخت کی کیا صورت ہو گی؟

میرے لئے یہ فکر مندی یوں پیدا ہوئی کہ ستر کی دہائی کے اواخر میں نظم سے اپنا رشتہ قائم کرنے والا شاعر ابرار احمد کہیں اب آ کے مجموعہ مرتب کرنے پر آمادہ ہوا ہے۔ حالانکہ اس دوران اس کی شاعری نے نہ صرف یہ کہ اپنی شناخت مستحکم کی بلکہ اس کے بعض ہم عصروں نے اس کے اثرات بھی قبول کیے۔ عجلت پسند شاعروں کے درمیان اپنی دھن میں مگن رہنے کے اسباب کا اندازہ تو اس کی نظموں کے مطالعے ہی سے ہو سکتا ہے مگر یہ طے ہے کہ کسی صنف سے کمٹمنٹ ایک سطح پر سہج سہج چلنے اور سنبھل سنبھل کر کاتنے کا بھی

تقاضہ کرتی ہے۔

تمام تر ادب کی تو جو صورت حال ہے سو ہے نظم کا معاملہ تو اور بھی دگرگوں ہے ——— نظم کے ساتھ ایک مشکل یہ ہے کہ اس کی روایت بنانے والوں نے اس کے مزاج کو قدرے تفکر پسند بنایا ہے جسے سہل پسندی قطعاً راس نہیں ——— لیکن اردگرد دیکھئے تو آپ کو ایسے شاعر تو کم ہی ملیں گے کہ جنہوں نے جستجو کرنے اور کھوج لگانے کا روگ پالا ہو مگر دو چار اچھی لائنوں پر داد پانے کی فکر کو ترجیح دینے کا رجحان اک بھیڑ کو لاحق دکھائی دے گا ———

یہ بات تسلیم کی جانی چاہیے کہ ہر صنف ادب اپنی بھی ایک روایت رکھتی ہے اور ایسے بہت کم ہوتے ہیں جو اس صنف کا مزاج بھی سمجھتے ہوں اور اس کی روایت کا شعور بھی رکھتے ہوں۔ نظم کے نئے تصورات راشد' میرا جی اور فیض سے جب آغاز ہوئے تھے تو شاعری میں ایک نئی طرح کی فکرمندی داخل ہوئی تھی ادب ذمہ داری کا کام تھا۔ نظم کی ہیئت میں فکری اعتبار سے جو روایت جگہ پانے لگی تھی اس کا تعلق انسان کی تخلیقی شخصیت سے تھا جسے مادی ارتقاء متاثر کرتا تھا۔ یہ اسی مزاج کی دین تھی کہ آگے ساٹھ کی دہائی میں نظم نے ایک نئی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ یوں ایک ایسی صنف کا سراغ ملا جو انسان کو اپنا محور بناتی تھی اور اس کے مقام کا تعین کرتی تھی۔

اس کے بعد زمانے نے کچھ ایسا رخ بدلا کہ شہرت کی چاٹ اور عجلت پسندی کے باعث تمام تر ادب سے بالعموم اور نظم سے بالخصوص سنجیدگی رخصت ہونے لگی ——— نظم سے بالخصوص اس لئے کہ اس کے نظریہ سازوں نے بعض متنازعہ مباحث کھڑے کر کے اس کی تخلیقی اپج کے راستے میں مشکلات بھی پیدا کیں اس سے خرابی یہ ہوئی کہ جب ستر کی دہائی کا آغاز ہوا اور نئے سیاسی سماجی اور نفسیاتی تموجات پیدا ہوئے تو انسان کے مسائل میں کچھ اور طرح کا بھی اضافہ ہوا۔ خارجی ماحول میں مقامی اور ہنگامی نوعیت کے مسائل کی اہمیت بڑھ گئی۔ شعر و ادب کے لئے اس سے دامن بچانا مشکل ہوا۔ یہ ایک نیا شعری

امکان تھا سو ہم نے دیکھا کہ اپنے مسائل سے حقیقی تعلق پیدا کرنے کے لئے ستر کی دہائی میں لسانی تشکیلات کا فارمولا تو قطعاً ناکافی ثابت ہوا—— نئے عصر میں انسان کی ذات کا روحانی سطح پر متاثر ہونا اور پھر اس سوال کا جنم لینا کہ خود اس کی موجودگی کیا معانی رکھتی ہے نئی نظم کی تحریک میں اساسی نظریئے کے طور پر آئے تھے مگر اب نئے حالات میں اس صنف کو نئی صورت حال کا سامنا تھا لیکن ہوا یہ کہ بیشتر جگالی کرتے رہ گئے یا پھر خارجی حالات کے بیان میں مقبول فارمولوں کا سہارا لیا۔ ارتقاء کی صورت بہت کم دکھائی دی۔ نتیجتاً نئے آنے والوں میں ایسے تو بہت کم دکھائی دیئے جو روایت کو درست طرح سے شناخت کر سکیں اور پھر اسے نئے عہد سے ہم آہنگ بھی کریں—— اس بہت ہی مختصر فہرست میں ثروت حسین' نسرین انجم بھٹی' افضال احمد سید' عذرا عباس' وغیرہم کے ناموں کو غنیمت جانا جا سکتا ہے جو اپنے اپنے اسلوب میں ہجوم سے الگ اپنا معیار قائم رکھتے ہیں—— اور مزید غنیمت ہے کہ ابرار احمد بھی کسی ایسی ہی اپنی راہ پر چل رہا ہے۔

ابرار احمد کا زمانہ وہی ہے جب گزشتہ شعری نظریات پر ایسے موضوعات غلبہ پانے لگے تھے جنہیں فوری توجہ درکار تھی۔ ملک پر مارشل لاء کی حکمرانی تھی جو مزاحمت پر اکساتی تھی لہٰذا جبر سے تصادم کا رویہ سب سے طاقتور حوالہ بن رہا تھا۔

ایک ایسے سماج میں جہاں استبداد کی مختلف النوع صورتیں انسان پر عرصہ حیات تنگ کر رہی ہوں وہاں موجود موضوعات کے پھیر میں عمومی انداز میں آ جانا بعید از قیاس نہیں ہونا چاہیئے۔ مقبول عام رویے اپنے اندر بڑی کشش رکھا کرتے ہیں مگر تاریخ کی رو کو تو اپنا سفر اپنے فطری انداز سے ہی جاری رکھنا ہوتا ہے۔ ایک اعتبار سے انسان پر تو ہر زمانہ ایک ہی طرح کے مسائل لے کر آیا ہے۔ ایک ہی طرح کے شب و روز اور زمانہ در زمانہ ایک ہی طرح کا مقسوم —— انسان کی یہی لاحاصلی' بے مائیگی' ذلت اور ہزیمت ابرار احمد کے شعور

کا مزاج بناتی ہے لہٰذا وہ خارج کی محض اوپری سطح پر تبصرہ کر کے الگ ہونے کی بجائے روحِ عصر کو شناخت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یوں ہجوم سے الگ ہو کر بھی سوچتا ہے یہی اس کی پہچان ہے۔

"ہوا ہر اک سمت بہہ رہی ہے
جلو میں کوچے مکان لے کر
سفر کے بے انت پانیوں کی تھکان لے کر
جو آنکھ کے عجز سے پرے ہیں
انہی زمانوں کا گیان لے کر"

اور پھر یہ کہ ———

"اذیت روز و شب میں
ہونے کی ذلتوں میں نڈھال صبحوں کی
اوس میں بھیگتی، ٹھٹھرتی
خموشیوں کے بھنور کے اندر
دلوں سے باہر ——— دلوں کے اندر
ہوا ہر اک سمت بہہ رہی ہے"

(ہوا ہر اک سمت بہہ رہی ہے)

ابرار احمد کی لفظیات میں ہوا کو یہ مرتبہ حاصل ہے کہ وہ تاریخ اور زمانے کے مترادف ہو جاتی ہے۔ ہم اس علامت کے توسط سے شہروں کے بسنے اور اجڑنے کا عمل بھی دیکھتے ہیں۔ دنوں کے نکلنے اور بکھر جانے کی کہانی بھی پڑھتے ہیں۔ گنبد خامشی کا در بھی کھلتا ہے اور اس آدمی کا احوال بھی بخوبی جان لیتے ہیں جس کی ذات صدیوں کے ملبے تلے پڑی کراہ رہی ہے۔

"دن نکلتے ہیں، بکھر جاتے ہیں
شہر بستے ہیں اجڑ جاتے ہیں

دستکیں، آہنی دروازے پر
سر کو ٹکرا کے پلٹ جاتی ہیں
گنبد خامشی گرتا ہی نہیں
چلتی رہتی ہے ہوا
کھیتوں میں، دالانوں میں
اور اپنے ہی تلاطم میں اتر جاتی ہے
ہر طرف پھول بکھر جاتے ہیں
دل کی مٹی پہ کوئی رنگ اترتا ہی نہیں"
(تم جو آتے ہو)

روح عصر کی شناخت اپنے عصر کی شناخت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ یہی حیلہ ہے جو کارگر ہے۔ شعری واردات ان تجربات کی بھی مرہون منت ہوا کرتی ہے، جو ذات کے گرد و نواح میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ بس ایک کھرے فنکار کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ جہاں وہ عصری مسائل کو اپنا پس منظر بناتا ہے وہاں اس کی اپنی ذات بھی ایک اہم ترین عنصر کے طور پر نمودار ہوتی ہے جسے موجودہ حالات ایک مخصوص شکل دینے کا جبر پیدا کرتے ہیں۔ یہی اس کے اسلوب کی انفرادیت کا معیار ہوتا ہے اور یہی اس کا امکان ہوتا ہے——

ابرار احمد نے اپنے عصر کو اپنی بعض نظموں میں خوب پہچانا ہے۔ "میں رستے کو دیکھ رہا ہوں" اس کی ایک ایسی ہی نظم ہے جو ہمارے سامنے اس منظر کو کھولتی ہے جس کی متعفن فضا میں سانس لینا بھی دشوار ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ چاندی جیسے چہروں والے ڈری ہوئی امیدوں کے ساتھ دھندلی آنکھوں پر ہاتھوں کا سایہ کئے کسی اچھے لمحے کے منتظر کھڑے ہیں جبکہ ہیلمٹ والے، لوہے کے دستانوں والے، ننگے ٹخنوں اور سبز عماموں والے ہاتھوں میں پتھر لئے ہر پل اپنا محاصرہ تنگ کئے جاتے ہیں—— مذہبی، تہذیبی اور سیاسی جبر کی یہ مکروہ صورت اسے مختلف کیفیتوں میں مبتلا کرتی ہے وہ تلملاتا ہے جھنجھلاتا ہے پژمردگی کا شکار

ہو جاتا ہے۔ اسے جادو کی ایسی چھڑی درکار ہے جو اس ناقابل برداشت منظر کو بدل سکے۔ وہ ایسی بارشوں کا منتظر ہے جو غلاظتوں کو دھو سکے اور انسان کی اس امید کو بار آور کر سکے جو وہ اپنی بقا اور توقیر کے لئے ازل سے روشن کئے ہوئے ہے ——— مگر گرد و پیش کا ماحول کسی سمت بھی کوئی رستہ نہیں دیتا۔ ""اکتائے ہوئے دوست سے"" ""خود کلامی"" ""تم کہاں تک گئے"" ""آخری دن سے پہلے"" اور ""تیری دنیا کے نقشے میں"" ——— اس کی چند ایسی ہی نظمیں ہیں جو اس کی بے حاصلی کو اور بھی گہری کرتی ہیں اور وہ سوچتا ہے کہ شاید یہی مقسوم ہے اور شاید گدا کے ہاتھ میں ہمیشہ ہی ٹوٹا ہوا کاسہ رہے گا ——— اور اگر ایسا ہے تو پھر کسی دھوکے میں کیا رہنا۔ یہ حالات کی اس سنگینی کا شاخسانہ ہے کہ وہ کسی کسی وقت الگ ہو کر بیٹھ جانے میں ہی عافیت پاتا ہے کہ ردعمل کی یہ بھی ایک صورت ہے ——— اور پھر ایک فقیر، ایک شاعر اس کے سوا اور کرے بھی کیا ———؟

میں دیوار کی طرح
اپنی کائی سے کام رکھتا ہوں
اذیت کوشی اور تذلیل نے
میرے دماغ کو ماتھا بنا دیا ہے
اتنا ترس کھا چکا ہوں
کہ میرا جسم بھر گیا ہے
میری نفرت کی گرفت میں
موسموں کے سانس اکھڑ گئے ہیں
میں نے اپنے پاؤں توڑ لئے ہیں
اور اپنے ہی سائے پر بیٹھ گیا ہوں
اور دنوں کے ملبے سے
ٹوٹے کھلونے اور منہدم زمانے اٹھائے ہوئے

آتی جاتی ہوا کو گالیاں دیتا رہتا ہوں
ایک پاگل شور
میرے تعاقب میں ہانپتا چلا آ رہا ہے ــــــ
(نظم)

منہدم زمانے، معدوم علاقے اور آتی جاتی ہوا کے انکشافات اس فکر کا نتیجہ ہیں جو موجودہ عہد کے انسان کو سمجھنے اور اپنی ذات پر پڑنے والے اثرات کے لئے اسے درکار ہوئے ــــــ اس کے عہد کی شعری صورت حال تو یہ ہے کہ عقلیت پسندی تابناک مستقبل کاتنے سے ہی فراغ نہیں پاتی جب کہ اسے آدمی کا سفر ہر پل رائیگاں ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے سامنے عہد در عہد ایک ہی طرح کا منظر کھلتا اور بند ہوتا رہتا ہے اور ہوا اپنے جلو میں کوچہ مکان لے کر اذیت روز و شب میں ہونے کی ذلتوں میں نڈھال صبحوں کی کہانی سناتی ازل اور ابد کے درمیان بہتی پھرتی رہتی ہے۔ جدید حسیت اور کیا ہے؟

جدیدیت اپنے درست معانی میں ایک عالمگیر رو تھی جو زوال آدم کو اپنا محور بناتی تھی ــــــ مغرب میں اٹھنے والی تحریکوں کو یہ فکر دامنگیر ہوئی تھی کہ انسان کی ذات درمیان میں سے غائب ہونے لگی ہے۔ جدید تہذیب نے جو مختلف النوع جذباتی نفسیاتی اور ذہنی پیچیدگیاں پیدا کی تھیں وہ ایک آفاقی سوال پر جا کر منتج ہوتی تھیں ساٹھ کی دہائی میں نئی نظم میں جو ہمارے ہاں تصادم، کشمکش، فراریت، مغائرت، اجنبیت اور ناراضگی کے عناصر نمایاں دکھائی دیتے ہیں وہ بلاشبہ خود ہمارے اپنے سماج کے پیدا کردہ تو تھے مگر اپنی ہمہ گیری میں آفاقی وسعت بھی رکھتے تھے۔

ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں جدیدیت کو ترقی پسند ادب کی ضد سمجھا جاتا رہا ہے۔ یہ خیال اس سبب سے تھا کہ دونوں طرف ایسے گروہ موجود تھے جو ادب کو یا تو کاملا" داخلیت کا کام تصور کرتے تھے یا خارجیت کا ــــــ دونوں کے درمیان ربط کی کوئی صورت نہ تھی ــــــ مگر جب تقسیم

کے بعد ترقی پسند تحریک پر پابندی عائد ہوئی اور سماجی حقائق نے ایک نئی شکل اختیار کی تو نظم نے فلسفہ وجودیت کی طرف اپنی رغبت بڑھا لی۔ غالباً" اس کا ایک سبب یہ تھا کہ فلسفہ وجودیت عقلیت پسندی سے گریز کے باوجود نہ صرف یہ کہ فرد کی آزادی کا حق تسلیم کرتا تھا بلکہ اس آزادی کے تعین کے لئے خارج کی طرف بھی دیکھتا تھا۔ یوں گویا داخلیت اور خارجیت کے درمیان ایک واسطہ استوار ہوا ——— ستر کی دہائی میں ایک ارتقاء البتہ یہ ہوا کہ انسان کی زبوں حالی پر تفکر کرنے کے لئے "نو ترقی پسندی" کی اصطلاح کو مقبولیت حاصل ہو گئی ——— کچلے ہوئے روندے ہوئے مظلوم لوگوں کا انبوہ جس انصاف کا طلب گار تھا وہ عصری حسیت تھی ——— انسان کی بے مائیگی' لاحاصلی تخلیقی فنکار کے لئے بہت سے مسائل لے کر آئی اس طرح وجود عصر حتیٰ کہ زندگی اور موت کے معانی بھی اپنی ہیئت بدلنے لگے۔

ابرار احمد ان معانی میں ضرور ایک وجودی شاعر ہے کہ اس کی ذات کو بھی تنہائی اور بیگانگی کا عارضہ لاحق ہے۔ فلسفہ وجودیت میں ہائیڈیگر سے سارتر تک بات تو شعور ذات ہی کی ہے۔ یہی تنہائی کا المیہ پیدا کرتی ہے اور یہی سرگرم بھی رکھتی ہے۔ اس سرگرمی میں فرد کی ذات جب شے کے مترادف ہوتی ہے تب ذلت کا احساس پیدا ہوتا ہے اور لوٹ جانے کو جی کرتا ہے۔ ابرار احمد کے ہاں یہ احساس بعض سطحوں پر اس ہزیمت کا پیدا کردہ ہے جو معمول کا مقسوم ہے۔ یہ اسی معمول کا شاخسانہ ہے کہ اس کی فکر میں یہ الجھن بار بار نمودار ہوتی ہے کہ اس طرح ہونا تو ایک ذلت ہے ——— بلکہ ہونا ہی ایک ذلت ہے ——— شاید یہی بات اسے عدم کی طرف رغبت دلاتی ہے۔ کامیو نے کہا تھا۔

Why are we here' all of us condemned to death

لوٹ جانے کی خواہش سے پہلے ابرار احمد زندگی کی کئی ہزیمتوں سے گذرتا ہے مگر یہی ایک بات اس کے تجربے میں آتی ہے کہ ہرچند ہر شے بدلنے کی حرکت میں ہے مگر بدلتا کچھ بھی نہیں ——— جب بدلتا کچھ بھی نہیں تو پھر

اس دنیا اور اس وجود سے کیا علاقہ رکھنا —— بس یہیں سے اس کا ایک نیا سفر آغاز ہوتا ہے جو وجود سے عدم اور حقیقت سے خواب کی طرف مراجعت کے دروازے وا کرتا ہے اور گذشتہ کی آسودگی اور طمانیت کی عدم موجودگی تاسف میں ڈھل جاتی ہے —— یہ ایک ALLIEN کی کہانی ہے۔

"کون سے دیس کی بابت پوچھے
وقت کے دشت میں پھرتی
یہ خنک سرد ہوا ——
کن زمانوں کی یہ مدفون مہک
بدنما شہر کی گلیوں میں اڑی پھرتی ہے"

اور پھر یہ بھی کہ ——

"ہم کہ کس دیس کی پہچان میں ہیں
ہم کہ کس لمس کی تائید میں ہیں
ہم کہ کس زعم کی توفیق میں ہیں
ہم کہ اک ضبط مسلسل ہیں
زمانوں کے ابد سے لرزاں
وہم کے گھر کے مکیں
اپنے ہی دیس میں پردیس لئے پھرتے ہیں
ہم کہ اک بھیس لئے پھرتے ہیں"

(ہم کہ اک بھیس لئے پھرتے ہیں)

دیس اور پردیس کی اس نئی تعبیر ہی سے ابرار احمد کی نظم اپنا رستہ بناتی ہے اس کا گرد و پیش کئی غلاظتوں سے لتھڑا ہوا ہے جو آدمی کو بیزار کر دینے کے لئے کافی ہے۔ معاشرتی اور سماجی استحصال آمریت کا جبر' یکسانیت کی سڑاند' طبقاتی تضادات' مذہبی منافرتیں' قومی اور بین الاقوامی سطح پر پھیلتے ہوئے مسائل خوف اندیشے اور خطرات اور اس پر مستزاد اپنے اصل سے دور لے جاتی ہوئی

زندگی ــــــ یہی گدلایا ہوا منظر بدنما شہر کی گلیوں میں اسے ALLIEN ثابت کرتا ہے تب کوئی یاد اسے گھیر لیتی ہے دھند اور خواب میں چھپی ہوئی کوئی قدیمی خوشگوار یاد ــــــ پھر وہ زمانوں کے درمیان سفر کرتے ہوئے اس مسرت کو تلاشتا ہے جو کھوئی گئی تھی۔ اس کا سماج چاہے انقلاب فرانس کے دور سے مماثل نہ ہو مگر اپنے اندر انارکی تو رکھتا ہے۔ اس طرح وہ روسو کا ہمزاد نہ ہوتے بھی موجود سے بیزاری اور اکتاہٹ میں کسی پناہ گاہ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے کہ مسرت کی تلاش تو اسے بھی ہے ــــــ سو یہ نیند میں چلنے کا عمل ہے۔

"میں ــــــ دنیا سے ایسے گزرتا ہوں
جیسے کوئی نیند سے گزرتا ہے۔"

سارتر کے ناول LA -- NAUSEA کے کردار ROQUENTIN پر دنیا جس طرح کھلی تھی کسی حد تک ابرار احمد کے لئے بھی گرد و پیش یہی کیفیت لاتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ سارتر کا کردار متلی کا شکار ہے جب کہ یہاں معاملہ اور ہے ابرار احمد کو نیند گھیرے میں لئے رہتی ہے۔

نیند ابرار احمد کا ایک مسلسل استعارہ ہے۔ یہ وہ حالت ہے جو اسے موجود کی ذلت سے نجات دلاتی ہے۔ وہ روز مرہ کی خرافات سے تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔ وہ کسی ایسے خواب میں ہے جو کہیں درمیان میں سے شکست ہوا۔ وہ جنت جس سے اسے نکالا گیا وہ زمانے جن سے وہ جدا ہوا' وہ بچپن جو قصبے کے گلی کوچوں میں کھیلتا رہ گیا ــــــ وہ آنکھیں' وہ ہاتھ' وہ موسم ــــــ اور وہ تمام شفاف اور پاکیزہ جذبے جو زندگی کی ہمہ ہمی آغاز ہونے سے پہلے آدمی کے وجود کا حصہ ہوتے ہیں ان کی طلب ابرار احمد کی شاعری کا ایک مسلسل موضوع ہے ــــــ وہ آدمی کی زندگی کو دو حصوں میں دیکھتا ہے ایک وہ کہ جس پر وہ قادر ہے اور ایک وہ کہ جس پر اسے کوئی قدرت حاصل نہیں ــــــ گرد و پیش' وقت اور زمانہ اس کی قدرت سے باہر ہیں وہ ان میں شریک تو ضرور ہے

مگران میں رہتے ہوئے اس کے وجود کو ایک محرومی' ایک تشنگی کا شدید احساس بھی ہے —— یہی سبب نیند کا ہوا۔

یہ بات جاننے کی ہے کہ نیند ابرار احمد کے ہاں فرار کا راستہ نہیں ہے بلکہ سپردگی کا تصور بھی ہے جو ہمیشگی میں ڈھلتا ہے یہ تصوف کی جہت ہے اس طرح ایک اعتبار سے نیند اس کے ہاں جاگنے کے معانی میں بھی آتی ہے اس طرف آنکھیں کھولنے کے معانی میں جو ماورائے حواس ہے۔

"وہ جو ماورائے احساس ہے
اسے روز و شب کے حساب سے
کروں بے دماغ میں کس طرح
کوئی آنسوؤں کی زبان نہیں
کوئی ماسوائے گماں نہیں
یہ جو دھندلی آنکھوں میں ڈوبتا کوئی نام ہے
یہ کہیں نہیں' یہ کہاں نہیں ——؟
یہ قیامِ خواب' دوامِ خواب
رہوں اس سے دور میں کس طرح
انہی ساحلوں پہ
تڑپتی ریت میں سو رہوں
مجھے اذن ذلت ہست ہو ——!"

(پس منظر کی آواز)

"پکی گندم کے خوشوں میں
اڈتے دن کے ڈیروں میں
اندھیرے کی گھنی شاخوں
پرندوں کے بسیروں میں
تھکے بادل سے گرتے نام کے اندر

اترتی شام کے اندر
دوام وصل کا اک خواب ہے
جو سانس لیتا ہے"

(دوام وصل کا خواب)

"ایک خواب ہزیمت دنیا
ایک آہٹ دوام خواہش کی
ایک جوڑی قدیم ہاتھوں کی
اور آنکھوں کے بند فرغل میں
ایک خواہش ہمیشہ رہنے کی"

(موت دل سے لپٹ گئی اس شب)

ابرار احمد کے ہاں I Return From him to him کی کیفیت جو ایک تسلسل اور تواتر کے ساتھ آتی رہتی ہے وہ اردو شاعری کی اپنی تخلیقی روایت کے ساتھ جڑی ہے اسی لئے یہ کہنا آسان ہوا ہے کہ اس کی وجودیت مغربی ادب سے مستعار نہیں بلکہ تصوف اور رومانویت کے ساتھ مشروط ہے۔ یہ دونوں عناصر مشرقی مزاج کے غماز ہیں اور یہی انسان دوستی کا راستہ ہموار کرتے ہیں۔

نئی ادبی تحریکوں کے زمانے میں ہمارے ہاں وجودیت کا جو غلغلہ اٹھا تھا اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ ہمارے سامنے جدید عہد کو سمجھنے کے لئے مغرب کے سوا اور کوئی مثال ہی نہ تھی۔ سارتر جو وجودیت کا علم بردار تھا اور فرانسیسی نو آبادیوں پر گزرنے والے شب و روز پر نوحہ کناں بھی رہتا تھا ایک معیار اور ایک سانچہ بن گیا تھا ــــــ اس میں کچھ قباحت تو نہ تھی مگر مشکل یہ ہوئی کہ جب ہماری مقامی صورت حال میں نت نئے پیچ پڑے اور یہاں کے آدمی کی ذات نے ذرا مختلف نوع کی صورت اختیار کی تو فیشن پرست شاعر مغرب کے بنے بنائے نظریات اور معیارات سے باہر نہ آسکا اس سے خود اس پر جو گزری یا

گزر رہی ہے وہ تو الگ تفصیل کی طالب ہے مگر نظم کی اپنی تخلیقی روایت کے ارتقاء کا راستہ اور بھی دشوار ہوا اور "نظم" کہنے والے کم ہو گئے۔

ابرار احمد کا امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنے تناظر میں رہتا ہے اور گرد و پیش سے کٹ کر کتابی مطالعے سے مواد چننے سے انکار کرتا ہے۔ منظر نامہ اس کے سامنے ہے اب یہ اس کی اپنی ترجیح ہے کہ وہ اس میں سے اپنے لئے کیا انتخاب کرتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ تنہا اور بے آسرا لوگ ہی تصوف کی طرف جلدی مائل ہوتے ہیں لیکن یہ تو طبع اور مزاج کی بات ہے۔ ابرار احمد کے ہاں معاشرتی دباؤ نے جو قضیہ پیدا کیا تھا وہ فطرت سے ہم آہنگ ہونے اور ابدیت سے دوام وصل کا باعث بنا ہے اور اس سارے تفکر میں اس کی رومانویت اس کے کام آتی ہے ——— رومانویت کا تصور تو خیر وجودیت میں بھی موجود ہے Emotionalism -- Hyper حساس طبیعتوں کا ایک مظہر ہوتا ہے اسی لئے تو وہ دکھ' درد' تنہائی' بیزاری اور الجھنوں میں مبتلا ہوتے ہیں مگر ابرار احمد کے ہاں سوگواری کی کیفیت میں اس وقت آسودگی اور اطمینان بھی در آتے ہیں جب وہ اپنے آپ کو اس خواب کے سپرد کرتا ہے جس میں نرمی ملائمت اور گداز کی آسائش گھلی ہوئی ہوتی ہے۔ سو وہ ہجر کی حالت میں بھی وصل کی کیفیت میں رہتا ہے۔ یہی متصوفانہ رجائیت ہے۔ مجید امجد نے اپنے واحد ٹیلیویژن انٹرویو میں کہا تھا کہ میں لکھنے میں اس مسرت کو تلاش کرتا ہوں جو اس دنیا اور کائنات سے مفقود ہوتی جاتی ہے۔ ابرار احمد بھی کچھ ایسا ہی کرتا ہے۔

ابرار احمد کی نظم جدید زندگی کے متنوع موضوعات سے عبارت ہے مگر یہ بات توجہ طلب ہو گی کہ اس کے خوابوں کا خمیر شہری زندگی کی اتھل پتھل سے ترتیب نہیں پاتا بلکہ فطرت سے ہم آہنگ ہوتا ہوا پر سکون اور آسودہ ماحول کا لینڈ سکیپ مرتب کرتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ نئی نظم کا بیشتر منظر نامہ شہری زندگی سے پیدا ہونے

والے تفکرات سے بنا ہے۔ جدید عہد میں تہذیبی سطح پر جو تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں انہوں نے انسان کے داخل کو نیا رخ دینے میں اپنا کام دکھایا ہے۔ انسان کے زوال کی کہانی اصل میں تہذیب کے زوال یا تہذیب کے ایک نئے رخ کو مڑ جانے کی کہانی ہے اور ''شہر'' اس کا استعارہ ہے۔ تنہائی اور مغائرت اسی شہر کے گلی کوچے ہیں۔

ساٹھ کی دہائی کی نظم میں شہر کا استعارہ ایک کلیدی لفظ رہا ہے۔ ہم نئی نظم میں شہر کی کربناکیوں اور ہولناکیوں کو اکثر موضوع بنتا دیکھتے رہے ہیں۔ یہ ایک طرح سے فرد کی ذات پر پڑنے والے دباؤ کا احتجاج تھا۔ بعد کی دہائیوں میں اس لفظ کی وسعتوں میں کچھ اور بھی اضافہ ہوا ہے ابرار احمد نے اس استعارے سے ہمہ جہتی کام لیا ہے وہ اس استعارے کو براہ راست حوالہ بنانے کی بجائے اسے بالواسطہ بھی استعمال میں لاتا ہے اور اپنے عہد کے خصائص کو بھی اجاگر کرتا ہے جو بدلتی ہوئی تہذیبی حقیقتوں سے وابستہ ہیں۔ اس طرح اس کی شاعری معنوی اعتبار سے اپنا ایک امتیازی وصف بھی بناتی ہے۔

جدید تہذیب نے ایک تو یہ کیا تھا کہ صنعتوں کے احیاء کے ساتھ ہی آدمی کا زمین سے رشتہ کمزور ہونے لگ گیا تھا۔ ایک زمین ہی کیا فطرت اور آدمی تک سے اس کے تعلق نے نئی شکل اختیار کرنی شروع کر دی تھی۔ یہ جو نیا سماج بن رہا تھا اس میں آدمیوں کا رخ شہروں کی طرف تھا اور اب بھی ہے۔ یہ ہجرت کلچر کی ہجرت بھی تھی۔ ابرار احمد کی شاعری اسی المیے کے ساتھ ربط پیدا کرتی ہے۔ تکنیکی اعتبار سے اس کے لئے ''شہر کا ہونا'' تکلیف کا باعث نہیں بلکہ ''شہر میں ہونا'' تکلیف کا باعث ہے۔

تھی صبح کس زمیں پر
اور شب کہاں پہ آئی
مٹی تھی کس جگہ کی
اڑتی پھری کہاں پر (مٹی تھی کس جگہ کی)

تقسیم کے بعد ہمارے ہاں شہروں کی طرف نقل مکانی کا عمل تیز ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ستر کی دہائی کی شاعری میں دریا' آسمان' درخت اور پرندے وغیرہ جیسے الفاظ ایک خاص نسٹالجک انداز میں استعمال ہوتے دکھائی دیتے ہیں جو پیچھے مڑ کر دیکھنے کا عمل ہے البتہ ابرار احمد کی تخصیص یہ ہے کہ اس کے ہاں اپنا چھوڑا ہوا منظر نامہ محض جزوی طور پر نہیں آتا نہ ہی صرف منظر نگاری کی شکل میں رہ جاتا ہے بلکہ یہ ایک طرز احساس ہے جو اس کی پوری شاعری میں سرایت کیا ہوا ہے ہمیں اردو شاعری میں اس نوع کی اور کوئی ایسی مثال نہیں ملتی۔ یہ انفرادیت صرف ابرار احمد ہی کا حصہ ہے کہ اس نے قصباتی زندگی کے نقوش کو ایک سائیکی کے طور پر پیش کیا۔

"ہم آئیں گے
نیند اور بچپن کی خوشبو میں سوئی ہوئی
تیری راتوں کی چھت پر
اجلی چارپائیاں بچھانے
موتیے کے پھولوں سے پرے
اپنی چیختی تنہائیاں اٹھانے
ہم۔ لوٹیں گے تیری جانب
اور دیکھیں گے تیری بوڑھی اینٹوں کو
عمروں کے رتجگوں سے دکھتی
آنکھوں کے ساتھ
اونچے نیچے مکانوں میں گھرے
گذشتہ کے گڑھے میں
ایک بار پھر گرنے کے لئے
لمبی تان کر سونے کے لئے

ہم - آئیں گے
تیرے مضافات میں
مٹی ہونے کے لئے ----!"

(قصباتی لڑکوں کا گیت)

ابرار احمد اپنے پیچھے ایک ثقافت کو معدوم ہوتے اور دم توڑتے دیکھتا ہے اور اسے موضوع بناتا ہے جسے شاید کل کوئی شناخت بھی نہیں کرے گا۔ اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے ورثے کو محفوظ کرنے کے فرض سے بھی سبکدوش ہوا ہے۔

قصباتی زندگی سے تعلق نے ابرار احمد کو اپنا شاعرانہ مزاج بنانے میں بھی بڑی مدد دی ہے۔ اس کی سبک لفظیات ایک طرف تو اسے فطرت سے قریب تر رکھتی ہے تو دوسری طرف بچپنے کے آنگن اور لڑکپن کی گلیاں حافظہ مرتب کرنے میں مددگار ہوتی ہے چونکہ اس کی بنیادی قدر عشق ہے لہٰذا اس نوع کا لسانی پیرایہ اسے ایک مخصوص ترنگ میں رکھتا ہے وہ بظاہر سادہ لفظوں سے کام لیتا ہے مگر ایسا نہیں ہے کہ محض ماحول سازی کر کے الگ ہو جاتا ہو بلکہ ان لفظوں کے استعاراتی روپ سے کام لے کر اپنا ایک الگ اسلوب وضع کرتا ہے جو اس کی نظم کی بنیادی شناخت ہے۔

شاعر کا تخیل اگر اپنے موضوعات سے میل کھاتا لسانی نظام نہ دے سکے تو ہر چیز بکھری ہوئی اور اجزا میں بٹی ہوئی منتشر دکھائی دے گی یہ منتشر خیالی کا شاخسانہ ہوتا ہے۔ ابرار احمد کے اکثر معاصرین کو یہی مخمصہ درپیش ہے۔ شعوری سطح پر کی گئی ترکیب سازی اور بے جوڑ تمثال نگاری نے عجلت پسندوں کو چونکانے کے عمل میں مبتلا کیا ہے۔ ابرار احمد نے مرعوب کرنے کے ان ہتھکنڈوں سے اسی لئے گریز کیا ہے کہ وہ شاعری کے ساتھ ایک واضح کمٹ منٹ رکھتا ہے اور اس کے اہداف واضح ہیں۔ اس نے کئی سامنے کے لفظوں کے کینوس کو وسیع کیا ہے۔ یہاں بطور خاص "ہوا" اور "بارش" کی مثال لی جا سکتی ہے۔ جو

متعین معانی سے باہر آتے اور ایک نیا استعاراتی رنگ اختیار کرتے ہیں۔

کھیتوں اور دالانوں میں ہونکتی پھرتی "ہوا" ابرار احمد کے ہاں "معدوم علاقوں اور منہدم زمانوں" تک رسائی کا ذریعہ ہے۔ اس کا تفصیلا" ذکر تو ابتدا میں ہو چکا —— کچھ یہی عالم "بارش" کا بھی ہے۔

بارش کا ایک کام تو یہ ہے کہ ایک رومان پرور فضا تشکیل دینے میں مدد فراہم کرتی ہے۔ اور ایک یہ کہ غلاظت کو دھوتی ہے ملمع اتارتی ہے منظر صاف ہو جاتے ہیں مگر ابرار احمد کی شاعری نے اس کے ایک اور معانی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

بارش ہماری زندگیوں میں ایک ایسا عامل بھی تو ہے جو معمول میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ زندگی کا عمل سست پڑ جاتا ہے۔ سو صوفیانہ مزاج کو جس نوع کی آہستہ روی درکار ہوتی ہے ابرار احمد اسے بارش کے عمل سے جنم دیتا ہے اور گرد و پیش کی اتھل پتھل سے فراغ حاصل کر لیتا ہے۔ گویا بارش ایک ایسی تحریک ہے جو خارج سے داخل کی طرف مڑ جانے کا راستہ کھولتی ہے۔ کھڑکیاں کواڑ بند ہو جاتے ہیں اور عقب میں جھانکنا آسان ہو جاتا ہے ——

تخلیقی عمل میں اشیاء کا ادراک تخیل کے اپنے مخصوص عمل ہی سے وجود میں آتا ہے۔ للٰہذا الفاظ اپنے لغوی معانی سے جدا ہو کر ایک نئے معانی کی طرف بڑھتے ہیں مگر ایسا اسی صورت میں ہوتا ہے جب شاعر کا مجموعی رویہ اس کی تصدیق کرتا ہو۔ جب شاعر لفظوں کے انتخاب کے لئے شعوری سطح پر چھان پھٹک کرے تو پھر اس کی شاعری کا مجموعی مزاج تشکیل پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ ابرار احمد کے ہاں اس کے متنوع موضوعات بھی اس لیے کسی ایک موضوع کا مختلف روپ بنتے ہیں کہ اس کا اسلوب اس کے تخیل اور اس کے مجموعی رویے کی مدد سے ادراک پیدا کرتا ہے —— اس طرح ایک اعتبار سے اس کا اسلوب اس کی نظم کی ضرورت بھی ہے محض پہچان ہی نہیں ——

ابرار احمد کی شاعری نے سیاسی بحران کے زمانے میں آنکھ کھولی تھی اور

تہذیبی بحران کی خبرپائی تھی۔ اس کا سب سے بڑا نقصان محبت کی گمشدگی تھا۔ وہ علاقہ اور وہ زمانہ جو خوشیوں سے لبریز تھا کہیں دور دھند میں غائب ہوتا جاتا تھا جب کہ گرد و پیش میں بڑھتی ہوتی بھیڑ میں انسان کی بے توقیری اور تذلیل تازیانے کا کام کرتے تھے ـــــــ اس طرح گویا اس نے زمانے کے دکھوں کو اس طرح بیان نہیں کیا جس طرح کہ بظاہر وہ تھے بلکہ اس طرح بیان کیا جس طرح کہ اس نے انہیں اپنے وجود پر جھیلا۔ یہ اپنے موضوعات سے اس کے سنجیدہ تعلق کا ثبوت بھی تھا اور نظم کے مزاج سے آشنائی بھی۔ کہا جا سکتا ہے کہ جو بات اسے اپنے ہم عصروں سے جدا کرتی ہے وہ یہی رویہ ہے کہ وہ اپنی نظم کا سرا وہاں جوڑتا ہے جہاں موجود روایت کی ڈوری ٹوٹتی دکھائی دیتی ہے اور ادھر کا رخ رکھتا ہے جہاں ایک نئے شعری امکان کی منزل اشارہ کرتی ہے۔

احمد جاوید

29 دسمبر 96ء

ترِی دُنیا کے نقشے میں

تری دنیا میں جنگل ہیں
ہرے باغات ہیں
اور دور تک پھیلے بیاباں ہیں
کہیں پر بستیاں ہیں
روشنی کے منطقے ہیں ——
پہاڑوں پر اترتے بادلوں میں

رقص کرتا ہے، سمندر چار سو ـــــ
اسی انبوہ کا حصہ نہیں ہوں میں
کہاں ہوں میں؟
میں تیرے لمس سے اک آگ بن کر پھیلنا
تسخیر کی صورت، بکھرنا چاہتا تھا
اور اترا ہوں
کسی بے مہر سناٹے کے میداں میں
ہزیمت کی دہکتی ریت پر
بکھرا پڑا ہوں، شام کی صورت
میں جینا چاہتا تھا تیری دنیا میں
ترے ہونٹوں پہ کھلتے نام کی صورت
کہیں دشنام کی صورت
کہیں آرام کی صورت
میں آنسو تھا
تیرے چہرے پہ آ کر پھول دھرتا تھا
ترے دکھ پر
گرا کرتا تھا قدموں میں
اے چشمِ تر ـــــ کہاں ہوں میں؟

اندھیرے سے بھری آنکھوں میں
چلتی ہے ہوا، ہر سو
اور اڑتے جا رہے ہیں، راستے اس میں
زمانوں کے کناروں سے
ابد کے سرد خانوں تک
ہوا چلتی ہے، ہر سو
اور اس کی ہم رہی میں
دو قدم چلتا نہیں ہوں میں
ہجومِ روز و شب میں
کس جگہ سہما ہوا ہوں میں
کہاں ہوں میں؟
تری دنیا کے نقشے میں
کہاں ہوں میں ——؟

مٹی تھی کِس جگہ کی

بے فیض ساعتوں میں
منہ زور موسموں میں
خود سے کلام کرتے
اکھڑی ہوئی طنابوں
دن بھر کی سختیوں سے
اکتا کے سو گئے تھے

بارش تھی بے نہایت
مٹی سے اٹھ رہی تھی
خوشبو، کسی وطن کی
خوشبو سے جھانکتے تھے
گلیاں، مکاں، دریچے
اور بچپنے کے آنگن
اک دھوپ کے کنارے
آسائشوں کے میداں
اڑتے ہوئے پرندے
اک اجلے آسماں پر
دو نیم باز آنکھیں
بیداریوں کی زد پر
تاحدِّ خاک اڑتے
بے سمت، بے ارادہ
کچھ خواب، فرصتوں کے
کچھ نام، چاہتوں کے
کن پانیوں میں اترے
کن بستیوں سے گزرے

تھی صبح کس زمیں پر
اور شب کہاں پہ آئی
مٹی تھی کس جگہ کی
اڑتی پھری کہاں پر
اس خاک داں پہ کچھ بھی
دائم نہیں رہے گا
ہے پانو میں جو چکر
قائم نہیں رہے گا
دستک تھی کن دنوں کی
آواز کن رتوں کی
خانہ بدوش جاگے
خیموں میں اڑ رہی تھیں
آنکھوں میں بھر گئی تھی
اک اور شب کی نیندیں ——

اور شہرِ بے اماں میں
پھر —— صبح ہو رہی تھی

تم جو آتے ہو

دن نکلتے ہیں، بکھر جاتے ہیں
شہر بستے ہیں، اجڑ جاتے ہیں
دستکیں، آہنی دروازے پر
سر کو ٹکرا کے پلٹ جاتی ہیں
گنبدِ خامشی گرتا ہی نہیں
چلتی رہتی ہے ہوا

کھیتوں میں، دالانوں میں
اور اپنے ہی تلاطم میں اتر جاتی ہے
ہر طرف پھول بکھر جاتے ہیں
دل کی مٹی پہ کوئی رنگ اترتا ہی نہیں
"آنکھ نظّارۂ موہوم سے ہٹتی ہی نہیں"
ذہن ——— اس حجلۂ تاریکی و تنہائی میں
اپنے کانٹوں پہ پڑا رہتا ہے
وقت آتا ہے، گزر جاتا ہے ———!

تم جو آتے ہو تو ترتیب الٹ جاتی ہے
دھند جیسے کہیں چھٹ جاتی ہے
نرم پوروں سے کوئی ہولے سے
دل کی دیوار گرا دیتا ہے
ایک کھڑکی کہیں کھل جاتی ہے
آنکھ۔ اک جلوۂ صد رنگ سے بھر جاتی ہے!
کوئی آواز بلاتی ہے ہمیں
تم جو آتے ہو
تو اس حبس، دکھن کے گھر سے

رنجِ آیندہ و رفتہ کی تھکاوٹ سے
نکل لیتے ہیں

تم سے ملتے ہیں
تو دنیا سے بھی مل لیتے ہیں!

آخری دن سے پہلے

بہت دن رہ لیا کوئے ندامت میں
ہزیمت کے بہت سے وار ہم نے سہ لیے
ترا یہ شہر، شہرِ جاں نہیں ہے
ترے اس شہر میں —— اب اور کیا رہنا
ہمارے خواب
ترے خار و خس میں تھے

ہمارے لفظ

تیری پیش و پس میں تھے
کہ ہم ہر سانس
تیری دسترس میں تھے
ترے اجلے دنوں سے
ہم کو کیا حصہ ملے گا
گدا کے ہاتھ میں
ٹوٹا ہوا کاسہ رہے گا
ہمیشہ کے لیے شاید
یہی قصہ رہے گا
اب اس دھوکے میں کیا رہنا
بہت دن رہ لیا کوئے ندامت میں!

بارش

تو آفاق سے قطرہ قطرہ گرتی ہے
سناٹے کے زینے سے
اس دھرتی کے سینے میں
تو ـــــ تاریخ کے ایوانوں میں در آتی ہے
اور بہالے جاتی ہے
جذبوں اور ایمانوں کو

میلے دستر خوانوں کو ——!
تو جب —— بنجر دھرتی کے ماتھے کو بوسہ دیتی ہے
کتنی سوئی آنکھیں کروٹ لیتی ہیں
تو آتی ہے
اور تری آمد کے نم سے
پیاسے برتن بھر جاتے ہیں
تیرے ہاتھ بڑھے آتے ہیں
گدلی نیندیں لے جاتے ہیں
تیری لمبی پوروں سے
دلوں میں گرہیں کھل جاتی ہیں
کالی راتیں ڈھل جاتی ہیں
تو آتی ہے
پاگل آوازوں کا کیچڑ
سڑکوں پر اڑنے لگتا ہے
تو آتی ہے
اور اڑا لے جاتی ہے
خاموشی کے خیموں کو
اور ہونٹوں کی شاخوں پر

موتی ڈولنے لگتے ہیں
پنچھی بولنے لگتے ہیں
تو جب — بند کواڑوں اور دلوں پر دستک دیتی ہے
ساری باتیں — کہہ جانے کو جی کرتا ہے
تیرے ساتھ ہی
بہہ جانے کو جی کرتا ہے

ہَوا ہر اِک سمت بہہ رہی ہے

ہوا ہر اک سمت بہہ رہی ہے
جلو میں کوچے مکان لے کر
سفر کے بے انت پانیوں کی تھکان لے کر
جو آنکھ کے عجز سے پرے ہیں
انہی زمانوں کا گیان لے کر
ترے علاقے کی سرحدوں کے نشان لے کر

ہوا ہر اک سمت بہہ رہی ہے
زمین چپ
آسمان وسعت میں کھو گیا ہے
فضا، ستاروں کی فصل سے لہلہا رہی ہے
مکاں، مکینوں کی آہٹوں سے دھڑک رہے ہیں
جھکے جھکے، نم زدہ دریچوں میں
آنکھ کوئی، رکی ہوئی ہے
فصیلِ شہرِ مراد پر
نامراد آہٹ اٹک گئی ہے
یہ خاک تیری مری صدا کے دیار میں
پھر بھٹک گئی ہے
دیارِ شام و سحر کے اندر
نگارِ دشت و شجر کے اندر
سوادِ جان و نظر کے اندر
خموشیِ بحر و بر کے اندر
ردائے صبحِ خبر کے اندر
اذیت روز و شب میں
ہونے، کی ذلتوں میں نڈھال صبحوں کی

اوس میں بھیگتی، ٹھٹھرتی
خموشیوں کے بھنور کے اندر
دلوں سے باہر
دلوں کے اندر
ہوا۔ ہر اک سمت بہہ رہی ہے!

دیر لگا دی تم نے

اس سے ملنا تھا
بہت دیر لگا دی تم نے
اے مری عمر!
بہت دیر لگا دی تم نے
میں نے سوچا تھا
کہ اس کارگہِ ہستی میں

چند سانس اپنی فراغت کے گھنے سائے میں
کھینچ پاؤں تو
اُسی سمت چلا جاؤں گا
میں نے سوچا تھا
کہ اس موڑ تلک جاؤں گا
جس سے رستے
ابدیت کی طرف مڑتے ہیں
اور موجود کی ذلت سے پرے
دشتِ امکاں میں
درختوں سے لپٹ جاؤں گا
اپنے دن رات کے لفظوں کی کھلی بارش میں
بھیگ جاؤں گا
اسی نام کے سایے سایے
چلتا جاؤں گا' بہت دور تلک
وقت ——— روٹھا ہوا بچہ ہے
منالاؤں گا
تو نے اے عمر ——— سنبھلنے نہ دیا
اپنی غفلت کی تھکاوٹ سے

نکلنے نہ دیا
خواب کے بیچ
جو اک اسم کا دروازہ تھا
کھولتے کھولتے
ہر سانس گنوا دی میں نے
اے مری عمر ——— بہت دیر لگا دی تم نے

ہم کہ اِک بھیس لیے پھرتے ہیں

کون سے دیس کی بابت پوچھے
وقت کے دشت میں پھرتی
یہ خنک، سرد ہوا
کن زمانوں کی یہ مدفون مہک
بدنما شہر کی گلیوں میں اڑی پھرتی ہے
اور یہ دور تلک پھیلی ہوئی

نیند اور خواب سے بوجھل بوجھل
اعتبار اور یقیں کی منزل
جس کی تائید میں ہر شے ہے
بقا ہے لیکن
اپنے منظر کے اندھیروں سے پرے
ہم خنک، سرد ہوا سن بھی سکیں!
ہم کہ کس دیس کی پہچان میں ہیں
ہم کہ کس لمس کی تائید میں ہیں
ہم کہ کس زعم کی توفیق میں ہیں
ہم کہ اک ضبط مسلسل ہیں
زمانوں کے ابد سے لرزاں
وہم کے گھر کے مکیں
اپنے ہی دیس میں، پردیس لیے پھرتے ہیں
ہم۔ کہ اک بھیس لیے پھرتے ہیں

موت دل سے لپٹ گئی اس شب

ایک خوابِ ہزیمت دنیا
ایک آہٹ دوامِ خواہش کی
ایک جوڑی قدیم ہاتھوں کی
اور آنکھوں کے بند فرغل میں
ایک خواہش ہمیشہ رہنے کی
ایک بستر، پرانی یادوں کا

اور سویا ہوا دلِ وحشی
آہنی انگلیوں کے پنجے میں
اک گھنی تیرگی کے رستے میں
ذائقہ، بھولی بسری بارش کا
ایک سایہ، جھکا ہوا دل پر
دیر تک آسماں سے گرتی ہوئی
ایک مدھم صدا دریچوں میں
ایک پر شور سیل کی آواز
سانس کی سلوٹیں، ڈبوتی ہوئی!
کون تھا، اس سمے کے آنگن میں
جاگتی رات کو تھپکتا ہوا
کون تھا، رات دن کے پھیرے میں
گئی دنیاؤں سے ابھرتا ہوا
رو رہا تھا دیارِ غربت میں
اور معدوم کے علاقے میں
اپنی آنکھوں میں ڈال کر مٹی
خواب تکتا ہوا میں بچپن کے
ایک ہنستے ہوئے، گزشتہ میں!

لوری سُنا

مٹی اب ان قدموں تلے بے چین ہے
لوری سنا
اے ماں ہمیں لوری سنا

وہ جو دن بھلے تھے گزر [illegible] گئے

وہ جو دن کڑے تھے گزر گئے
وہ جو پہلی رت کے گلاب تھے
انہی راستوں میں بکھر گئے
ہمیں بے کلی ہے نہ چین ہے

لوری سنا

یہ وہ شہر خواب و نظر نہ تھا
یہاں خاک میں وہ ہنر نہ تھا
یہاں دل زدوں کا گزر نہ تھا
پس گرد راہ رواں رہے
یونہی در پئے دل و جاں رہے
جو رہے بھی ہم تو کہاں رہے

ترے ناز ہم نے اٹھائے تھے
ترے پھول ہم نے کھلائے تھے
ترے زخم دل سے لگائے تھے
ہمیں اذن رنج سفر تو دے
ہمیں واپسی کا ثمر تو دے
ہمیں اپنی گود میں گھر تو دے

پس منظر کی آواز

کسی بھولے نام کا ذائقہ
کسی زرد دن کی گرفت میں
کسی کھوئے خواب کا وسوسہ
کسی گہری شب کی سرشت میں
کہیں دھوپ چھاؤں کے درمیاں
کسی اجنبی سے دیار کے

میں، جوار میں پھروں کس طرح؟
یہ ہوا چلے گی تو کب تلک
یہ زمیں رہے گی تو کب تلک
کھلے آنگنوں پہ
مہیب رات، جھکی رہے گی تو کب تلک
یہ جو آہٹوں کا ہراس ہے
اسے اپنے میلے لباس سے
میں، جھٹک کے پھینک دوں کس طرح
وہ جو ماورائے حواس ہے
اسے روز و شب کے حساب سے
کروں بے دماغ میں کس طرح؟
کوئی آنسوؤں کی زباں نہیں
کوئی ماسوائے گماں نہیں
یہ جو دھندلی آنکھوں میں ڈوبتا کوئی نام ہے
یہ کہیں نہیں
یہ کہاں نہیں؟
یہ قیامِ خواب، دوامِ خواب——
رہوں اس سے دور میں کس طرح

انہی ساحلوں پہ
تڑپتی ریت میں سو رہوں
مجھے اذنِ ذلتِ ہست ہو

سرپھری ہَوا

ہے شامِ ابرو باراں
پردے ہلے دلوں کے
آنکھوں سے چھو کے گزرے
سپنے گئے دنوں کے
بجنے لگے دریچے
انجانی سرخوشی سے

کتنے اڑائے چھینٹے
اس سرپھری ہوا نے
دل میں تری طلب کے
بجنے لگے ترانے
جو دھول جم گئی تھی
وہ دھل گئی ہے آخر
جو بھیڑ میں اچانک
ہونٹوں سے گر گئی تھی
دھن۔ مل گئی ہے آخر!

مَیں رستے کو دیکھ رہا ہوں

اتنے لوگ ہیں تیری جانب دیکھنے والے
چاندی جیسے چہروں والے
اجلے اجلے خوابوں، میلے کپڑوں والے
صدیوں کے گرداب میں جکڑی چیخوں والے
ڈری ہوئی امیدوں، سہمی سانسوں والے
اچھے دنوں کی آس پہ زندہ

دھندلی آنکھوں پر
ہاتھوں کا سایہ کرکے
تیری جانب دیکھ رہے ہیں
میں رستے کو دیکھ رہا ہوں!
ہیلمٹ والے
اکڑے کوٹوں، تنی ہوئی پتلونوں والے
لمبے دانتوں، لوہے کے دستانوں والے
ننگے ٹخنوں، خوشبودار قمیضوں والے
اپنی کالی خواہش کے کیچڑ میں لت پت
تیری جانب دیکھ رہے ہیں
میں رستے کو دیکھ رہا ہوں

رستہ، جس پر
خوش الحان ربوبیت کا سایہ ہے
رستہ جس پر
سبز عماموں میں ملبوس
اندھیرے کے سوداگر
پتھر بانٹ رہے ہیں

تیری پیشانی کی خاطر
رستہ جس پر
تیرے بڑھتے قدموں کی آواز سنائی دیتی ہے

ڈرتے ڈرتے
میں بھی شاید
تیری جانب دیکھ رہا ہوں

دوامِ وصل کا خواب

پکی گندم کے خوشوں میں
اڑتے دن کے ڈیروں میں
اندھیرے کی گھنی شاخوں
پرندوں کے بسیروں میں
تھکے بادل سے گرتے نام کے اندر
اترتی شام کے اندر

دوامِ وصل کا اک خواب ہے
جو سانس لیتا ہے
مہکتی سرزمینوں میں
مکانوں میں، مکینوں میں
ترے میرے علاقوں میں
ہمارے عہد ناموں میں
لرزتے بادبانوں میں
کہیں دوری کے گیتوں میں
کہیں قربت کی تانوں میں
ازل سے تا ابد پھیلی ہوئی
اس چادرِ افلاک کے اندر
ردائے خاک کے اندر
ہماری نیند کی گلیوں میں
اپنی دھن بجاتا ہے
مکانِ عافیت کے بند دروازے گراتا ہے

مجیدؔ امجد کے لئے

تم آتے ہو دور دیس سے
دور دیس سے آنے والوں پر
ہر کوئی ہنستا ہے
دل ڈرتا ہے
جب سرد ہوا کے آنچل میں
منہ ڈھانپ پرندے سوتے ہیں

جب شام ڈھلے دیواروں پر
کچھ سائے گڈمڈ ہوتے ہیں
کچھ شکلیں رنگ جماتی ہیں
اجڑی اجڑی دہلیزوں پر
خاموشی دستک دیتی ہے
اور بند کواڑوں کی تنہائی
ہرسو' خاک اڑاتی ہے
اس لمحے کوئی
دل میں کروٹ لیتا ہے
جب وقت کے کاہل ماتھے پر
ناموں کی بوندیں گرتی ہیں
مٹی میں خوشبو گھولتی ہیں
ہرپھول کے دل میں
آتی رت کا دھڑکا جاگنے لگتا ہے
تب دھیان میں جانے کس بستی سے
دھیمے دھیمے قدموں کی آواز سنائی دیتی ہے
تم۔ آتے ہو؟

تم آؤ گے؟
دل ڈرتا ہے

تم کہاں تک گئے

اپنے قدموں کے نیچے
پھسلتے ہوئے راستوں
فاصلوں سے الجھتے ہوئے
آنکھ کی سرحدوں پر درختوں کے جھنڈ ——
غیر آبادیوں سے پرے
وادیوں سے پرے

دھند کے نرم ہاتھوں میں ٹھٹھرے ہوئے
آسماں سے پرے
تم کہاں تک گئے ——؟
خواہشوں سے پرے
نیلی پیلی رگوں کی گرہ کاٹ کر
بھوک سے ' پیاس سے
آنسوؤں سے پرے؟
لحظہ لحظہ بدلتی ہوئی رت کی بوچھار میں بھیگ کر
جسم کی ذلتوں
خواب کی لذتوں
ریشمی نیند ' بیمار بیداریوں سے پرے
دن کے میلے پسینے کو
ماتھے سے دھوتے ہوئے
تم کہاں تک گئے ——؟
خواب کی نرم ساعت —— تمہارے لیے
وقت کے سارے تیور
حزیں، مضمحل
"نیند کی مار کھائے ہوئے"

روز و شب کی اذیّت میں اترے ہوئے
یہ غصیلے ہجوم ——
اس زمیں سے پرے
اس یقیں سے پرے ——؟
اس حصارِ زمان و مکاں کی حدوں تک
تو —— ہم بھی گئے
تم —— کہاں تک گئے ——؟

مٹّی سے ایک مکالمہ

ماں کہتی ہے

"جب تم چھوٹے تھے تو ایسے اچھے تھے
سب آباد گھروں کی مائیں
پیشانی پر بوسہ دینے آتی تھیں
اور تمھارے جیسے بیٹوں کی خواہش سے
ان کی گودیں، بھری رہا کرتی تھیں ہمیشہ

اور میں تمھارے ہونے کی راحت کے
نشے میں
کتنی عمریں چُور رہی تھی ——"
اک اک لفظ مرے سینے میں اٹکا ہے
سب کچھ یاد ہے —— آج
کہ میں اک عمر نگل کر بیٹھا ہوں
عمر کی آخری سرحد کی بنجر مٹی
جب سے ماں کے ہونٹوں سے گرتے لفظوں میں
کانپتی ہے
میری سانس تڑپ اٹھتی ہے
اس کے مٹتے نقش مرے اندر
کہرام سی اک تصویر بنے ہیں
زندگیوں کے کھوکھلے پن پر
آنسووں لپٹی، ہنسی مرے ہونٹوں پہ لرزتی رہتی ہے
اچھی ماں ——!
عمر کے چلتے سائے کی تذلیل میں
تیرے لہو کے رس کی لذت
تیرے غرور کی ساری شکلیں

ان رستوں میں، مٹی مٹی کر آیا ہوں
پتھریلی سڑکوں پہ اپنے ہی قدموں سے
خود کو روند کے گزرا ہوں
میرے لہو کے شور میں تیری
کوئی بھی پہچان نہیں ہے
تیری اجلی شبیہ، کچھ ایسے دھندلائی ہے
تجھ سے وصل کی آنکھ سے
بینائی زائل ہے
میں تیرے دردوں کا مارا
تیری ہی صورت، میں بھی
اک جیون ہارا

جو بھی لمس ہے

نیند کا دن سے ربط عجب ہے
پلکیں خواب کے ان جانے لفظوں سے بوجھل
دھوپ کی چادر میں لوگوں کی جلتی آنکھیں
شورِ جہاں میں ڈوبتی جاتی آہٹ دل کی
پیاس کی زد پر سارے لمحے
اپنی آنکھیں موند کے دیکھو

نیند کی ٹھنڈی خنک ہوا میں
چلتے بولتے سانسیں لیتے
زندہ سایے
دن کے کاہل ماتھے کو ہاتھوں سے چھو کر
بادل کی رفتار ہوئے
ہر دل میں بیدار ہوئے
جو بھی لمس ہے
زندہ ہے۔ نیندوں کے اندر
بھیگی بھیگی راتوں کی گدلائی چپ میں

خواب، شبیہیں، دن

دن کے بوجھل ہاتھ کے دل پر پڑ جانے سے پہلے اکثر
خوابوں کی بیمار شبیہیں
دور دور تک آنکھوں کے میدانوں میں
بھیگتے پیڑوں کے گیتوں کا لمس بنیں

نیند کی ٹھنڈی برف ردا میں

اپنی آنکھیں میچ کے
ان دنیاؤں کی تصویر اجالی ہے میں نے
جن کی دھن میں میرا دل
جانے، انجانے
دیکھے، ان دیکھے رستوں پر
قطرہ قطرہ ٹپک گیا تھا
میں نے اپنی سانسیں تھام کے پوچھا۔ ہے ان عمروں سے

خوابوں کی بیمار شبیہیں
رات کی میلی چادر میں
نیند بھری آنکھوں میں جاگ کے
کن دنیاؤں، کن رستوں کے نام بسا کر
کیسے دن کے پیلے میدانوں میں اوجھل ہو جاتی ہیں
دھوپ کی قیدی ہو جاتی ہیں

موجود سے پرے

کتنی باتیں ہیں لبھانے والی
ناشتہ' دودھ'
نئے دن کا پرانا اخبار'
دوشِ امروز پہ ماضی کا غبار'
خوابِ آسودگی
آوارہ خرامی دل کی

میلے کپڑوں میں گئی رات کا گدلا پانی
اور بانہوں میں مچلتی ہوئی
بیدار ہنسی
اجلے دالان میں
قدموں سے لپٹتی ہوئی خوش پوش ہوا
اور آنکھوں پہ کوئی ہونٹ
نئے لمس کی آسائش میں'
یاد کے رخ پہ
اڑے ہوئے موجود کے بادل کی ردا
اور متروک علاقوں میں کہیں
ایک آواز ———
فراموش زمانوں میں اترتی ہوئی
دم توڑتی' بیکار صدا

برسوں بعد

آنکھوں میں آ رکا ہے
اک خواب بے وطن سا
آنگن میں چاند اترا
بیتی ہوئی شبوں کا
دل میں دہک اٹھا ہے
سویا شرر لہو کا

تو ہم کو مل گیا ہے
اس بے اماں نگر میں
جوں' امن کا جزیرہ
سیلابِ شور و شر میں
اک گوشۂ تسلی
نفرت کے بام و در میں
اک فرصتِ نظر ہے
جو ہم کو ہے میسر
تو ہے تو ہم کو تھوڑی
راحت بھی ہے میسر
کچھ پھول کِھل اٹھے ہیں
اس سونی رہگزر میں
کچھ دن گزر سکیں گے
اسبابِ چشمِ تر میں
یہ کب رہا تھا ممکن
اس نیند کے سفر میں!

زندہ آدمی سے کلام

کبھی وقت کی سانس میں
ہونٹ الجھا کے دیکھے ہیں تم نے ——؟
کہ اس بدگماں موسموں کے مغنی کی تانیں
نہاں خانۂ دل میں
گہری خموشی کی ہیبت گراتی چلی جا رہی ہیں
ازل سے ابد تک بچھڑتے ہوئے

سیلِ بے مائیگی میں کبھی
دل اکھڑتے ہوئے، شہر گرتے ہوئے
دیکھ پائے ہو —— تم ——؟
کبھی بھیگے بھیگے سے دیوار و در میں
کہ بچپن کی گلیوں، مکانوں میں
بارش کی آواز سے دل دہلتے ہوئے
کسی مشترک خوف کی آہٹوں سے
دھڑکتے ہوئے، بام و در اور زینے
مسلسل ہوا اور بارش کی آواز چلتی ہوئی
کبھی —— منہ اندھیرے کی تقدیس میں
دور سے آتی گاڑی کی سیٹی کو سنتے ہوئے
تم نے سوچا ہے ان کے لیے
جن کے قدموں میں —— منزل
مسلسل عذاب، اور خوابوں سے تعبیر تک دور ہے
کبھی شام کی سنسناتی ہوا میں
ٹھٹھرتی خموشی کی سہمی صدا اس کے
دروازہ کھولا ہے ان کے لیے
جن کے ہاتھوں کی لرزش میں دستک نہیں

مجھے پوچھنا ہے ——
کہ کھلتے ہوئے پھول، چلتی ہوا
اور گزرے مہ و سال کی دستکوں پر
نہ ہو سکنے والوں پہ آنسو بہائے ہیں تم نے
کہ میں
رات کی ایک ہچکی میں ٹھہری ہوئی سانس ہوں
اور تمھاری گھنی نیند کے بازوؤں سے
پھسلتا ہوا لمس ہوں

کتنے بیکار ہیں دن

کتنے بیکار ہیں دن
دل میں وہ لہر مچلتی ہی نہیں
جس کی منہ زور کھلی باہوں میں
خوش نما پھول بہا کرتے تھے
آنکھ کی جھیل میں
اک چاند کھلا رہتا تھا

اب وہ موسم ہی نہیں
جس کی تھکی راہوں میں
ہم نے قدموں کے نشاں چھوڑے تھے
اب کوئی پھول کہیں کھلتا نہیں
کتنے دکھ، خواب کے دروازے پر
اپنا کشکول لیے بیٹھے ہیں
اور یہ ہاتھ، کہ ہلتا ہی نہیں
رات۔ اندیشۂ پیہم لے کر
پھول سے چہروں پہ گرتی ہی چلی جاتی ہے
اور یہ دل، کہ مہکتا ہی نہیں
پانْو توڑے ہوئے
گھر بیٹھ گیا ہوں، جیسے
اپنی اس قبر سے باہر
کوئی دنیا ہی نہیں
جیسے اس وہمِ خوش اندام کے آنچل کے سوا
میرے سر پر کوئی سایہ ہی نہیں!

اُکتائے ہوئے دوست سے

بہت ہی دور سے آواز آتی تھی تری جیسے
کوئی اکتائے لہجے میں
مری تنہائیوں پر
میرے روز و شب کی یکساں ذلتوں
پسماندگی کے زہر میں لپٹی ہوئی
اس ذات کی ہمسائیگی پر

ہنس رہا ہو۔ دیر تک
اور دور تک ——!
یہاں پر لوگ رہتے ہیں
ترے جیسے ' مرے جیسے
اداسی اور معذوری کی ذلت میں
ہنسی کی رُت میں
آسایش کے صحنوں میں
بدلتے موسموں کے ساتھ
اک رقص بہاراں ' تیز ہوتا ہے
مگر اس رقص کا حصہ نہیں ہوں میں
نہیں ہے تو
مجھے بھی خاک یہ ' اپنی نہیں لگتی
مگر میں دیکھتا ہوں تیری جانب
اور جی اٹھتا ہوں
تیرے لمس کے نشّے میں گہرے خواب بنتا ہوں
مگر یہ بھول جاتا ہوں
ترے اجلے نئے کپڑوں پہ
میرے نام کا دھبّا ترے جی کو جلاتا ہے

ترے دل میں
مری پاگل رفاقت شور کرتی ہے
کہ تجھ کو یاد آتا ہے
کسی تیرے ہی موسم کی نمی سے۔ ترا زمانہ
جس کے منظر میں نہیں ہوں میں
مگر میں کیا کروں
افلاک کے نیچے، کوئی جابر نہیں ہوں میں
کوئی جادو نہیں ہے پاس میرے
یہ منظر، کس طرح تبدیل کر دوں؟

سمندر سے مکالمہ

دور سمندر
دور بہت ہی دور
دوری کا سنگیت ہوائیں
اس کے عمق کی میت ہوائیں
چپ بستی کا گیت، ہوائیں
گہرے رستے "سیت" ہوائیں

اور تھکن سے چور، سمندر
دور بہت ہی دور

۲

تیرے نم کی باس سمندر
تیرے نم کی باس
تو بادل کی پوروں میں چلنے والا اک جوگ
تیرا سایہ، نقش اڑاتا
چہروں کا سنجوگ
تجھ سے چاہت رکھنے والے
سدا منائیں سوگ
تیرے ہونٹوں سے چپکی ہے
کن صدیوں کی پیاس، سمندر
تیرے نم کی باس، سمندر
تیرے نم کی باس

۳

دوری کا ہر بھید سمندر

ہم کو تجھ سے پیار
تیری لہر پہ بہنے والی
آنکھیں اتریں پار
سانسیں پی کر، جسم اگل دے
تجھ میں سب سنسار
ہم ہیں جیون ہار، سمندر
ہم ہیں جیون ہار

۴

بھولی بسری یاد سمندر
بھولی بسری یاد
تیرے نم کے گیت سے دوری، ابد میں چلتی جائے
تجھ سے پیار بڑھا کر اس جیون کی کتھا پچھتائے
تیری کھوج میں نکلے دل کو کیسے کوئی سمجھائے
سانسیں دھول میں لت پت
آنکھیں، مٹی میں آباد۔ سمندر
بھولی بسری یاد

کیسے اُتروں پار

میں نے تیرے ساتھ سمندر پار کیا
کٹھن دنوں کا
خوابوں اور آوازوں کا
اور انجان جزیروں کی تنہا راتوں کا
موت کی کالی لہروں سے بچ کر نکلا ہوں
تیرے ہاتھوں کی کشتی میں

اور اب تیرے بدن سے گرتی
بوندوں کی مہکار میں سویا رہتا ہوں
ساحل ' یاد
اندھیرے کی نم ناک پھوار
ٹھنڈی ریت پہ گرے پڑے ہیں
تیری سانسوں کے پتوار
اور اب یہ ـــــــ اک اور سمندر
کدھر گئے ترے ہاتھ ـــــــ؟

پچھلے پہر کی دستک

ترے شہر کی سرد گلیوں کی آہٹ
مرے خون میں سرسرائی
میں چونکا
یہاں کون ہے
میں پکارا، مگر
دور خالی سڑک پر کہیں

رات کے ڈوبتے پہر کی خامشی چل پڑی

رت جگوں کی تھکاوٹ میں ڈوبی ہوئی
آنکھ سے۔ خواب نکلا کوئی
لڑکھڑاتا ہوا
رات کے سرد آنگن میں گرتا ہوا
خالی شاخوں میں اٹکے ہوئے
چاند کی آنکھ سے ایک آنسو گرا
اور سینے میں گم ہو گیا
دھند کی نرم پوریں
مساموں میں چلنے لگیں
دو طرف ایستادہ درختوں کے نیچے'
بہے آنسوؤں کی مہک میں مجھے
نیند آنے لگی

اجنبی کون ہو

اجنبی کون ہو
کن زمینوں، زمانوں سے چلتے ہوئے
کیسی بستی کی خوشبو لپیٹے ہوئے
میرے دل کے نگر میں قدم رکھ رہے ہو
تمہارے خدوخال پر، کس لیے
اجنبیت کی مانوسیت

گہری، اندھی مسافت کی دھول
اور لاحاصلی کی تھکاوٹ جمی ہے——

کوئی ان دیکھی، ان جانی آواز
بے انت دوری، ہواؤں کی بے راگنی سے الجھتی ہوئی
جب سماعت میں
سرگوشیاں بن کے گرتی ہے
یہ دل سنبھلتا نہیں
یہ جو عمروں کی گنتی ہے
اس کے عدد بھول جاتے ہیں
کچھ یاد رہتا نہیں
یہ جو دل کے سمندر میں
کھولے ہوئے بادباں دیکھتے ہو
یہ ٹکڑے ہیں بیتی ہوئی ساعتوں کے
اسی ساحلِ بے اماں پر
پھسلتی ہوئی ریت پر نام ہیں
جن کے حرفوں میں
میری طنابیں گڑی ہیں

یہیں چار سو
اک گھنیری خموشی میں سہما ہوا
دل کا میداں ہے جس پر
گرجتا ہوا ابر چھایا ہوا ہے
برستا نہیں ہے
اندھیرے کی چادر افق تا افق چھاؤں ہے
دوریاں بھی تو اک خواب ہیں' تیری میری طرح
اور پھر کونسی ایسی آہٹ ہے جس سے
در و بام دل کے دھڑکنے لگیں
واہمے کے سوا
تم بھی شاید کوئی واہمہ ہو
ہر اک واہمے کی طرح!

ہَوا جب تیز چلتی ہے

ہوا جب تیز چلتی ہے
شکستہ خواب جب مٹیالے رستوں پر
مرا دامن پکڑتے ہیں
جھکی شاخوں کے ہونٹوں پر
کسی بھولے ہوئے نغمے کی تانیں
جب الٹتی ہیں

گزشتہ وہم کی آنکھیں، مرے سینے میں گرتی ہیں
ستارے جب لرزتے ہیں
مری آنکھوں کی سرحد پر
افق، دھندلانے لگتا ہے
مہک آتے دنوں کی پھیل جاتی ہے
مشام جاں میں اک منہ زور خواہش
موت بن کر۔ جاگتی ہے جب
گزشتہ وہم کی آنکھیں مرے سینے میں گرتی ہیں
گلے جب وقت ملتے ہیں
ترے میرے زمانوں کے پرندے
اڑنے لگتے ہیں
سحر جب دھیمی دستکوں میں
نیند کی جھولی میں گرتی ہے
میں تیرے ہاتھ
خوابوں کے پھسلتے لمس پر محسوس کرتا ہوں
ترے ہونٹوں کی لرزش
مجھ سے رخصت میں لپٹتی ہے
میں تجھ کو دیکھ سکتا ہوں——

مجھے پھر مل سکے گا واہمہ؟
جس قید میں آکر
مری عمریں سنورتی ہیں
وہ موسم جس میں تیرے نام کی خوشبو
مری سانسیں بھگوتی ہے
وہی اک شام
جس آنچل میں میرا دل دھڑکتا ہے
وہی اک زندگی جس میں
گزشتہ وہم کی آنکھیں مرے سینے میں گرتی ہیں

اور بارش ہے

اپنی بیکار محبت کی سیہ کاری میں
بھیگ جاتا ہوں
تو سو جاتا ہوں
اور بارش ہے کہ گرتی ہی چلی جاتی ہے
بند آنکھوں پہ
تھکے اعضا پر

شہرِ نم ناک میں
سانسوں سے بھری گلیوں پر
اور راتوں کی گھنی شاخوں میں
نارسائی کی طنابوں سے بندھے جسموں پر
اور ناکردہ گناہوں کے
تعفن زدہ کپڑوں سے بھرے کوٹھوں پر
اور بے انت کے میدانوں میں ــــــ!

نمناک صداؤں میں رہنے والی

وہ تخلیق کی گود میں سسکیاں لیتی ہے
اس کی بھکی، نم سانسوں میں
ننھے منے بچوں کی آنکھیں اٹکی ہیں
اور لرزتے ہونٹوں سے
جو لفظ رہا ہوتے ہیں
ہندسے بن جاتے ہیں

اس کی شکستہ باہنوں کے جھولے میں
چہرے کھیلتے ہیں
سرما جیسی
اس کے خوابوں کی چادر
سورج مانگ رہی ہے ——
اس کے ہاتھوں میں ریشم کے موزے ہیں
جن میں اس کی انگلیاں
نرمی۔ اور گداز سی لذت میں
چلتی رہتی ہیں
قدموں میں اک پیاس کی بوندیں
سہمی آوازوں کا پانی
میں، یخ بستہ خون میں
اس کی آہٹ سنتا رہتا ہوں
لیکن اک دن وہ
میری آنکھوں میں ٹھنڈی ہو جائے گی

دن گزرتے رہے

سیلِ بے آب میں
عمرِ بے خواب میں
صبحِ شب تاب میں
ایک رنجِ مسلسل کے پھیلے ہوئے
گہرے بادل میں، آنکھیں لپیٹے ہوئے
کام چلتے رہے

نام بنتے رہے
زرد پیلے دنوں کے تسلسل میں اک عاجزی
پیر پھیلائے لیٹی رہی
چار اطراف پھیلے
دھوئیں کے غلافوں میں اترے ہوئے
موسموں کے پراسرار رستوں کی دہشت میں
گرتی ہوئی سرخ اینٹوں کے کہرام میں
تنگ گلیوں کی چھت سے ٹپکتے ہوئے
سرد، اوندھے کٹوروں کی بارش میں جھکتے، سنبھلتے
ہوئے
وقت پاگل کی اک خود کلامی کی صورت لپٹتا ہوا
اس مسافت کی دھول
اور رستوں کی سختی میں ہم
عمر کے فاصلے کاٹتے، سر جھکائے ہوئے
زینہ زینہ اترتی ہوئی رات میں
خواب ڈوبے ہوئے
یہ ستارے، زمیں، آسماں
خاک میں ان کی ہمسائیگی کی علامات بکھری ہوئیں

وقت کی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے
دن کے ماتھے پہ، خوابوں کے بوسے بجھے،
ان لکھے نام
حرفوں کی صورت بناتی ہوائیں بکھرتے ہوئے،
ہاتھ میں ہاتھ ڈالے
کہ ہم اجنبی تھے
ہمیں۔ لمس، تائید کے زعم میں
ایک گہری، گھنیری پناہ گاہ تھا
ایک دوجے سے تادیر لپٹے رہے
دیر تک اپنے سایوں سے لڑتے رہے
دن۔ گزرتے رہے!

مَیں نے اس کو دیکھا تھا

میں نے اس کو دیکھا تھا
جب پہلے پہل
ان نیند بھری گلیوں میں اس نے
اپنی چاپ جگائی تھی
بھیدوں بھرا لبادہ
اس کے جسم پہ تھا

دھان کے کھیتوں کی خوشبو
کپڑوں میں تھی
اور بالوں میں
اس کے اپنے نام کی'
مٹتے نام کی مٹی گندھی ہوئی تھی
دھند میں الجھی شاموں میں
وہ ریستوران کی اوٹ میں بیٹھ کے
اپنی آگ جلاتا تھا
اور ٹھٹھرتی راتوں کی خاموشی میں
اک آواز لگاتا تھا
میں نے اک دن دیکھا تھا
اس کے بنجر ہاتھوں کی سختی میں
موسم ٹوٹ رہے تھے
جھاگ اڑاتے دریا
کالے سینے سے بہ نکلے تھے
اور غصیلی آنکھوں میں
اک پاگل خوف کی سنگینی تھی
دور کہیں پر

کھیتوں میں بارش گرتی تھی
میدانی رستوں کی بانہیں کھلی ہوئی تھی

۲

ریستوران کی اوٹ میں
جلتی آگ پہ پانی برس رہا تھا
اور دھوئیں کی کڑوی خوشبو
سانسوں میں اتری جاتی تھی
میزیں اس پر الٹ گئی تھیں
اک مکّار خموشی میں
دروازے اس پر بند ہوئے تھے
میں نے اس کو شہر کے چوک میں دیکھا تھا
گدلی راتوں کا کیچڑ
میلی آنکھوں میں پھیلا تھا
بھیدوں بھرا لبادہ
کانپتے ہاتھوں سے پھسلا جاتا تھا

اس کے مٹتے نام کی
مرتے نام کی مٹی
چہروں پر اڑتی پھرتی تھی
اور ہوا کے دوش پہ اک بے نام صدا
بے خواب مکانوں میں تھک کر
گرتی جاتی تھی

•

بات کیا تجھ سے کروں

بات کیا تجھ سے کروں
دن ——!
کہ مرے ماتھے پر
تیری دستک کی سیاہی میں بجھے جاتے ہیں
کتنی راتوں کی اداسی میں سلگتے ہوئے
لفظوں کے اجالے

جو چھپا رکھے تھے
اپنی سانسوں میں
تری رہ پہ بچھانے کے لیے
دن ـــــ!
کہ جلا ڈالے ہیں
اپنے تپتے ہوئے ہاتھوں کی کڑی سختی میں
تو نے وہ لوگ
جو کمھلائی جبینوں پہ اٹھالائے تھے
تیرے جھلسے ہوئے چہرے کے لیے رنگ
ترے پانْو میں دھرنے کے لیے
دن ـــــ!
کہ اجالے نے ترے
کیسا اندّھیر مچا رکھا ہے!
بات کیا تجھ سے کروں
رات ـــــ!
کہ آنچل میں ترے
منہ چھپائے ہوئے گھر سوتے ہیں
شہ نشینوں پہ تری چاپ کے ساتھ

کتنی آنکھیں، مرے سینے میں بھر آتی ہیں
تیری بے انت خموشی کے گھنے جنگل میں
کتنے خوابوں کے خنک چاند
اتر جاتے ہیں
اور شاخوں سے تری
کوئی مہکار تلک آتی نہیں
تیری آواز، مجھے بھاتی نہیں
بات کیا تجھ سے کروں
عمر ——!
کہ تھک جاتا ہوں
اور نم ناک منڈیروں سے
میرے دن رات پھسل جاتے ہیں
تیری ممتا بھری چھاتی کی دکھن
میرے ریشوں میں اتر جاتی ہے
اور اڑتے ہوئے بالوں میں
میری آواز، بھٹک جاتی ہے

ہر سال کی آخری نظم

پیاس ہے، ہر طرف
پیاس ہی پیاس ہے
سر پہ بادل جھکے ہیں
برستے نہیں
راستوں پہ ازل سے رواں
قافلوں کے قدم۔ ڈولتے بھی نہیں

فاصلے بولتے بھی نہیں
وقت کی دھند میں
سہمے سمٹے ہوئے
ان مکانوں کی خاموشیوں کے لیے
دل پہ اک بوجھ ہے
جن کے آنگن
کسی نرم چاہت کی صبحوں کی خاطر کشادہ نہیں
ایستادہ نہیں
منزلوں کے لیے
جن کی سمتوں پہ گہرا
اندھیرا تنا ہے
جو چھٹتا نہیں
دربدر سر پٹکتی ہوا کے لیے
جس کی آہٹ پہ در کوئی کھلتا نہیں
اپنے دل کے مسافر کی خاطر
کہ جس کو کوئی راہ ملتی نہیں
دوستوں کے لیے
جن کے ہونٹوں سے گرتے ہوئے لفظ

سانسوں میں الجھے ہوئے خواب کے شور میں
ڈوب جاتے رہے ——
تھکن اور بیداریوں کے تسلسل میں بھٹکی ہوئی
جن کی آنکھیں
یہ منظر —— بدلتے ہوئے دیکھنے کے لیے
خاک ہونے کو ہیں
اپنے اطراف میں
شور و غل کے غلافوں میں اتری ہوئی
خامشی کے لیے
دل پہ اک بوجھ ہے
معبدوں کی اداسی میں ٹھہرے ہوئے
آنسوؤں کے لیے
ان دعاؤں کی خاطر
جو بے معنی لفظوں میں اپنے لیے راستے ڈھونڈتی ہیں

لرزتے ہوئے آسماں کے لیے
اس زمیں کے لیے
جس پہ بادل جھکے ہیں

برستے نہیں
پیاس ہے، ہر طرف
پیاس ہی پیاس ہے!

عرصۂ خواب میں

نقش بر آب ہیں
عرصۂ خواب ہیں
واہموں کی سیاہی میں
گھلتے ہوئے راز ہیں
اپنے ہونے نہ ہونے کی ساعت میں
اپنی ہی تانوں میں الجھے ہوئے

ساز ہیں
رنگ جمتے نہیں
دن بدلتے نہیں
دوریوں کے سوا، کچھ بھی ملتا نہیں
راس، کچھ بھی نہیں
پاس کچھ بھی نہیں
اے زمان و مکاں ——!
دوریوں کے ابد خواب میں
وقت کی سرمئی آہٹوں میں چھپے
ایک دھندلے جہاں
بے جہت آسماں
اپنی آنکھوں پہ مٹی کی چادر لپیٹے ہوئے
روز و شب میں رواں
جانی، انجانی بے چارگی
اور دلوں میں، بدلتے ہوئے موسموں سے اترتی
اداسی کے کہرے میں اپنے
سوالوں کی یخ بستہ خاموشیوں کو سنبھالے ہوئے
ناتواں

اپنے قدموں پہ جھکتے ہوئے
دکھتے شانوں پہ دھرتی اٹھائے ہوئے
اپنے منظر کی تشکیل میں
ڈھونڈتے ہیں تجھے
معبدوں کے دھندلکے میں بھیگی ہوئی
اے نگاہِ حزیں
کون ہے تو
ترے بعد بھی کیا نہیں؟

راس آئے گا کیا
اے دلِ بے یقیں
اپنی عمروں کی قبروں میں سہمے ہوئے
کب تلک
تیری جانب یونہی دیکھ پائیں گے ہم؟

لوری

یہ سارے کھیت ' جنگل ' پھول ' میداں
یہ رستے خاک میں لپٹے ہوئے
حدِّ نظر سے تا ابد
اک دھند کی چادر میں سہمی بستیاں
اور وقت کا پھیلاؤ ——
اسی معمورۂ ظلمت کے اندر

ہمارے زرد رو ناموں کے تارے ٹوٹتے ہیں
اور مدھم سی لکیریں چھوڑ جاتے ہیں
میں اس ابہام سے خوش ہوں
تمہارے نام سے خوش ہوں
ہمارے ساتھ جو کچھ وقت کر جاتا ہے
میں اس کام سے خوش ہوں

غیر آبادیوں میں ایک نظم

دور تک
غیر آبادیوں سے پرے
وقت اور خواب مل کر بناتے رہے
تیرے ہونے کے نام و نشاں
دل دکھاتے رہے
دھیرے دھیرے گزرتے مہ و سال

تیرے جلو میں ہمکتے مہکتے ہوئے

اور ہم ــــــــــ

دشت و صحرا میں

اونچے پہاڑوں کے دامن میں

کڑوے کسیلے زمانوں کی سیٹی بجاتی ہوا

اپنے سینے میں تھامے رہے

اجنبی آشنائی کی آہٹ میں محبوس

اپنی زمیں کے لیے

نم زدہ سانس بن کر رہے

دل گرفتہ رہے

راتوں میں

راتوں میں جب گہرے سناٹوں کا شور ابھرتا ہے
دوری کی معدوم اوٹ میں
تیری تھکی ہوئی آواز اتر جاتی ہے
آج بھی جب دھیرے دھیرے صبحِ کاذب کی خنک ہوا
چلنے لگتی ہے
ان ہونے خوابوں کے پھول لرز اٹھتے ہیں

دن میں آنکھیں 'لوگ' مکان
ڈھیروں باتیں
اک بیکار الجھاو
رات کو ایک اکیلا کمرہ
اور بر فیلی سیٹی۔ سانس
آنکھوں میں اتری جاتی ہے
تیری گہری گہری خاموشی کی رنگت
میں بھی چپ ہوں 'تو بھی چپ ہے
اور ہمارے ہونٹوں پر
افلاک سے بارش گرتی ہے!

نہ جانے ہم کس طرح ملے تھے

انوار احمد کے نام

یہ دھند کیسی کہ تیرے رستے
کبھی مرے راستوں سے آ کر گلے ملے ہیں
کبھی کسی دوار کی کھٹک میں
کبھی کسی سانس کی دھمک میں
بچھڑ گئے ہیں یہ راستے
اپنے اپنے قدموں تلے کی گہری زمین کو بھی

انہیں درختوں میں تیرا چہرہ
طویل رستوں پہ پھیلتی دھند کی رداہیں اتر گیا ہے
نہ جانے ہم کس طرح ملے تھے
یہیں کہیں تو نے آنسوؤں سے بھگوئی مٹی
اور آج بھی خاک میں ہے تیری صدا کا کنکر
ترے مرے خواب کی ردا سے —— ٹپکتی بوندوں
میں بھیگتا ہے
یہیں کہیں کے ہی راستوں نے
لپیٹ لی ہیں تمام عمریں
جو تیرے میرے لہو کے خوابوں کی سلطنت تھیں
ہماری سانسیں طویل کرنے کی منزلوں پر کھڑی ہوئی تھیں
نہ جانے ہم کس طرح ملے تھے
نہ جانے ہم کس طرح جدا ہیں
مکان ہیں، ان میں چپ کی ارتھی
تمام آنگن ہواؤں کی سسکیوں سے لبریز اور گم ہیں
کبھی کبھی تیری گم شدہ سمت کو ہلاتا ہوں ہاتھ اپنے
وہی مرا دستکوں کی گردش میں
مضمحل اور اداس چہرہ

تجھے کہاں میں دکھائی دوں گا
کہ اب تو میں زندگی سے ہارے ہوئے قبیلے کا آدمی
ہوں ——
اسی زمیں کی ترائیوں میں گرے پڑے ہیں
ترے مرے ماہ و سال سارے
ملال سارے
نہ جانے ہم کس طرح ملے تھے

مجھے ڈر لگتا ہے

آؤ ہم آج ہی کھل کر رو لیں
جانے کب وقت ملے
آنکھ میں جتنے بھرے ہیں آنسو
آؤ ہم آج بہا دیں ان کو
گھات میں عمر بھی ہے
وقت بھی، رفتار بھی ہے

کون جانے کہ ملیں راستے کب منزل سے
کون جانے کہ رہا ہوں گے سفر سے کب تک
کون جانے یہاں کس رت کی ردا سے اتریں
پھول، جن میں تری مہکار نہ ہو
کون یہ جان سکے، تیرے حروف
میرے ہونٹوں سے کہاں ٹوٹ گریں
شہر آیندہ کے بت خانے میں
کیا پتا اک تری تصویر نہ ہو
یوں تو اب کیا ہے جو کھونا ہے مجھے
اب تو بس چین سے سونا ہے مجھے

دائرے ختم کہاں ہوتے ہیں

اور وہ شام عجب تھی
جب زمینوں سے اٹھے رستے ——
مری آنکھوں سے نکلے تو مجھے یاد آیا
دائرہ دائرہ رستوں کی خنک بستی میں
کوئی بھیگی ہوئی آہٹ میں چلا کرتا تھا

اور یہ شام عجب ہے
میں نے نم ناک ہواؤں سے کہا
"دائرے ختم کہاں ہوتے ہیں
اس کی بستی سے جو گزرو
تو مرے نام کی اک بوند ——— گراتی جانا"

تھکن زدہ امانت کی واپسی

دور تک پھیلے آفاق میں سنسناتی ہوا
تیری سانسوں کی چاہت میں ہے
تو مری سانس کیوں کھینچنا چاہتا ہے——
دیکھ
سینے کے اس خول میں کچھ نہیں ہے
فقط گھونٹ ہیں کچھ، ہوا کے

ہے جن پر زمانوں سے اڑتی ہوئی
دھول کی زرد کائی ـــــــ
اجنبی!
میں نے تاریک گلیوں میں
برفیلے لمحوں کو آنکھوں سے چھوتے ہوئے
عمر جھیلی
مری آنکھ نم۔ نیند ہی زندگی ہے یہاں
اجنبی!
یوں ہوائیں، نمی لے اڑیں گی
تو مری آنکھ میں تیرتے خواب، پلکوں سے چن لے
کہ میں یہ امانت
بہت دیر تک تھام سکتا نہیں!

مجھے اچھے لگتے ہیں

مجھے اچھے لگتے ہیں
بادل۔ جب وہ برستے ہیں
اور آنکھیں جن میں کوئی بھی بسیرا کر سکتا ہے
بکریاں اور بچے
جو سڑک پار کر جاتے ہیں
اور نہیں دیکھ پاتے اس آہنی ہاتھ کو

جو ان کے تعاقب میں دوڑا چلا آتا ہے
ڈاکیے کے قدم اور انسومنیا کی چائے
اور بجھی بتی کا موٹر سائیکل
جو اشارہ کاٹتے ہوئے
رات میں راستہ بناتا گزر جاتا ہے
مجھے اچھے لگتے ہیں
باغی' نیند' درخت اور خواب
جو اس بیداری کے موسم میں کہیں دکھائی نہیں دیتے
مجھے اچھے لگتے ہیں
فراغت اور دکھ سے بھرے دن
اور راتیں
جب دور دور تک بارش ہوتی ہے
اور آبائی مکانوں کی وہ شام
جب بہنوں کو رخصت کیا جاتا ہے
پہاڑ کے پار کے اندھیارے کی جانب
آنسو اور دھند
جن میں صاف دیکھا جا سکتا ہے
اور وہ دل جنہیں نشانہ بنایا جاتا ہے

اور مٹی جس کی جانب ہمیں لوٹنا ہے
مجھے اچھے لگتے ہیں
دریچے جن سے ہوا گزرتی ہے
دروازے جو کبھی بند نہیں ہوتے
اور دوست جن کے کندھوں پر ہمیشہ ہاتھ رکھا جا سکتا ہے
اور تم ــــــ!

لپکتے ہوئے ہاتھوں اور دنیا کے درمیان
کیا کچھ موجود ہے!

روئی ہوئی آنکھ سے

روئی ہوئی آنکھ سے
دنیا بہت صاف دکھائی دیتی ہے
بچہ بہت خوبصورت ہے
اس کی وردی میلی ہو جائے گی
اور باپ کا ہاتھ
اسے کسی بھی موڑ پر چھوڑ دے گا

دن بہت اجلا ہے
اسے گدلا کر دیں گے یہ ہاتھ
رات بھر ہوا چلے گی
ٹھنڈی' تاریک' منہ زور
رگوں میں اتر جائے گی
پھر بھی ——
بارش ہو رہی ہے
بارش میں بھیگتے کپڑے اور راستے
مجھے اچھے لگتے ہیں
کیوں نہ بارش میں کہیں دور نکل جاؤں
لیکن رات ہو گئی ہے
اور ابدی جدائی کی سمت
کھلنے والی یہ کھڑکی
اور تمہاری آنکھیں
بھر جائیں گی اندھیرے سے ——
محبت دکھ تو دیتی ہے
لیکن یہ دکھ بہت گہرا ہے
نیند کی طرح

مٹی میں اترے ہوئے پانی کی طرح
میرا شہر
میری مٹی بن گیا ہے
مجھے زمین مل گئی ہے
رہنے کے لیے
اور اوڑھنے کے لیے

یہ ہارا ہوا دل
ایک مرتبہ پھر
تمہارے سینے میں دھڑک لینا چاہتا ہے
تم کہاں ہو؟
دنیا میری باتوں پر ہنستی ہے
اور میری پرانی گاڑی
چھینٹے اڑاتی ہے
جو سب سے زیادہ
میرے اپنے لباس پر پڑتے ہیں

تم نہیں دیکھتے

دلوں سے دہلیزوں
اور خوابوں سے تعبیروں تک کا سفر
طے کرتی ہیں آنکھیں
یا قسمت
یا پھر طے ہو جاتا ہے یہ سفر
محض اتفاق سے

اور ہر سفر کی اپنی منزل ہوتی ہے
اور اپنی صعوبت
اور آدمی کے پاس ہوتی ہیں
صرف آنکھیں

آنکھیں دیکھتی ہیں
دور کے راستوں کو
اور رگوں کو بھر دیتی ہیں
موسموں اور منظروں کی آگ سے
اتار دیتی ہیں تھکن
اور دیکھتی رہتی ہیں
رات دن چمکتے جگنوؤں کی طرح
تھوڑا زادِ سفر باندھ لیتی ہیں
یادداشت کی گٹھڑی میں ــــــ
ہنستی ہیں
اور دیکھتی رہتی ہیں
کھلتے ہوئے پھول
بارش میں بھیگتے ہوئے

درخت اور آدمی
دریاؤں کے کنارے،
آبادیوں میں اترنے والی شام
مسکراتی ہوئی دھوپ
اور مکتب سے نکلتے بچوں کی
اجلی وردیاں ——
روتی ہیں
اور دیکھتی رہتی ہیں
ایڑی میں چبھ جانے والی کیل
اڑتے ہوئے بادل
معدوم ہوتے ہوئے ماہ و سال
ابدیت کے جنگل میں
بھٹکتی ہوئی چاندنی
اور ہاتھوں سے گرتی ہوئی مٹی
آنکھیں نکل جاتی ہیں قدموں سے آگے
اور مکمل کردیتی ہیں سفر
بھر جاتی ہیں
اور دیکھتی رہتی ہیں

گزری ہوئی بستیاں
اور ان میں ایستادہ ایک گھر
اور دہلیز پر کھلا ہوا پھول
اور آغاز کی سرخوشی اور ملال کے سایے
آنکھیں ——— دیکھتی رہتی ہیں
لیکن تم نہیں دیکھتے

پڑے رہتے ہو
عقب کے اندھیروں میں
لمبی تان کر
اور نہیں جانتے
آنکھیں کیا کچھ دیکھ سکتی ہیں!

یادوں اور بادلوں میں

چاندنی میں آنکھیں بھیگ گئی ہیں
شاید کہیں کچھ ہوا ہے
کوئی دیوار گر گئی ہے
یا رونے کی آواز آ رہی ہے
کوئی کھلونے بیچ رہا ہے
بچے سکول جا رہے ہیں
یا دروازے پر دستک ہو رہی ہے

شاید اس لڑکی نے زہر کھالیا ہے
یا پھر وہ بوڑھا پاگل ہو گیا ہے

دیواروں میں پانی سویا ہوا ہے
رات کے دالان میں موتیے کے پھول کھلے ہیں
یا پھر درختوں میں ہوا چل رہی ہے

یادوں اور بادلوں میں گھومنے سے
آدمی بہت دور نکل جاتا ہے
شاید ہوا تیز ہو گئی ہے
یا پھر بادل منڈیروں تک جھک آئے ہیں
اندھیرے میں
ڈوبتے ہوئے ہاتھ دکھائی دیتے ہیں
"تم کون ہو——؟"
حالانکہ اس سے کیا ہوتا ہے
بارشوں میں مٹی بیٹھ جاتی ہے
خواب دیکھنے
اور نیند میں چلنے والوں کے لیے

کوئی جگہ نہیں

اور پھر میں یہاں سے چلا جاؤں گا
اپنے خوابوں کے ساتھ
نیند کے جنگل میں
یا سو رہوں گا ——— یہیں کہیں
تمھارے آس پاس ———

قصباتی لڑکوں کا گیت

ہم تیری صبحوں کی اوس میں بھیگی
آنکھوں کے ساتھ
دنوں کی اس بستی کو دیکھتے ہیں
ہم تیرے خوش الحان پرندے
ہر جانب تیری منڈیریں کھوجتے ہیں
ہم نکلے تھے

تیرے ماتھے کے لیے بوسہ ڈھونڈنے

ہم آئیں گے
بوجھل قدموں کے ساتھ
تیرے تاریک حجروں میں پھرنے کے لیے
تیرے سینے پر
اپنی اکتاہٹوں کے پھول بچھانے
سرپھری ہوا کے ساتھ
تیرے خالی چوباروں میں پھرنے کے لیے
تیرے صحنوں سے اٹھتے دھوئیں کو
اپنی آنکھوں میں بھرنے
تیرے اجلے بچوں کی میلی آستینوں سے
اپنے آنسو پونچھنے
تیری کائی زدہ دیواروں سے
لپٹ جانے کے لیے
ہم آئیں گے
نیند اور بچپن کی خوشبو میں سوئی ہوئی
تیری راتوں کی چھت پر

اجلی چارپائیاں بچھانے
موتیے کے پھولوں سے پرے
اپنی چیختی تنہائیاں اٹھانے
ہم۔ لوٹیں گے تیری جانب
اور دیکھیں گے تیری بوڑھی اینٹوں کو
عمروں کے رت جگوں سے دکھتی آنکھوں کے ساتھ
اونچے نیچے مکانوں میں گھرے
گزشتہ کے گڑھے میں
ایک بار پھر گرنے کے لیے
لمبی تان کر، سونے کے لیے
ہم آئیں گے، تیرے مضافات میں
مٹی ہونے کے لیے

ہمارے دُکھوں کا علاج کہاں ہے

اگر ہمارے دکھوں کا علاج
نیند ہے
تو کوئی ہم سے زیادہ گہری نیند نہیں سو سکتا
اور نہ ہی اتنی آسانی اور خوبصورتی سے
کوئی نیند میں چل سکتا ہے
اگر ہمارے دکھوں کا علاج

جاگنا ہے
تو ہم اس قدر جاگ سکتے ہیں
کہ ہر رات ہماری آنکھوں میں آرام کر سکتی ہے
اور ہر دروازہ
ہمارے دل میں کھل سکتا ہے
اگر ہمارے دکھوں کا علاج
ہنسنا ہے
تو ہم اتنا ہنس سکتے ہیں
کہ پرندے درختوں سے اڑ جائیں
اور پہاڑ ہماری ہنسی کی گونج سے بھر جائیں
ہم اتنا ہنس سکتے ہیں
کہ کوئی مسخرہ یا پاگل
اس کا تصور تک نہیں کر سکتا
اگر ہمارے دکھوں کا علاج
رونا ہے
تو ہمارے پاس اتنے آنسو ہیں
کہ ان میں ساری دنیا کو ڈبویا جا سکتا ہے
جہنم بجھائے جا سکتے ہیں

اور ساری زمین کو
پانی دیا جا سکتا ہے
اگر ہمارے دکھوں کا علاج

جینا ہے
تو ہم سے زیادہ با معنی زندگی
کون گزار سکتا ہے
اور کون ایسے سلیقے اور اذیت سے
اس دنیا کو دیکھ سکتا ہے
اگر ہمارے دکھوں کا علاج

بولنا ہے
تو ہم ہوا کی طرح گفتگو کر سکتے ہیں
اور اپنے لفظوں کی خوشبو سے
پھول کھلا سکتے ہیں
اور اگر تم کہتے ہو:
ہمارے دکھوں کا علاج کہیں نہیں ہے؛
تو ہم چپ رہ سکتے ہیں
قبروں سے بھی زیادہ

وہ میری راہ دیکھتی ہے

وہ میری راہ دیکھتی ہے
وہ میری راہ ایسے دیکھتی ہے
جیسے جاگتے میں نیند
یا نیند میں خواب دیکھتے ہیں
منہ اندھیرے کھیتوں کو جاتے ہوئے
کپاس کے پھول چنتے ہوئے

یا اوک سے پانی پیتے ہوئے
کاندھوں پر بادل دھرے
یا ہونٹوں میں پھول تھامے
کھلی چھت پر تاروں سے کھیلتے
یا لحاف میں منہ چھپائے
درختوں سے لپٹ کر
یا چاندنی اوڑھ کر
دن کے میدانوں میں
یا شام کی اوٹ سے
وہ ہواؤں کے رنگ دیکھتی ہے
اور میری راہ دیکھتی ہے
تعمیر سے انہدام تک
زمان و مکان کے درمیان
موجود سے معدوم تک
وہ میری راہ دیکھتی ہے
اور زمین
نیا آسمان اوڑھ لیتی ہے
پیڑ ـــــ پرندے تبدیل کر لیتے ہیں

چاند نئے پانیوں پر جھک جاتا ہے
اجنبی موسموں کی
ہوا چلتی ہے ——— راستوں میں
مٹی اڑتی ہے
اور بیٹھ جاتی ہے
وہ نیند میں چلتی ہے
اور مری راہ دیکھتی ہے

ہر روز

ہر روز کوئی قلم ٹوٹ جاتا ہے
کوئی آنکھ پتھرا جاتی ہے
کوئی روزن بجھ جاتا ہے
کوئی دہلیز اکھڑ جاتی ہے
کوئی سسکی جاگ اٹھتی ہے

کوئی ہاتھ ٹھنڈا ہو جاتا ہے
کوئی دیوار گر جاتی ہے
اور کوئی راستہ بن جاتا ہے

ہر روز کہیں کوئی چھت بیٹھ جاتی ہے
کوئی درخت کٹ جاتا ہے
کوئی خواب بکھر جاتا ہے
کوئی آہٹ رخصت ہو جاتی ہے
اور ایک آواز ــــــ اپنی آمد کا
اعلان کر دیتی ہے
کوئی جنگل اُگ آتا ہے
اور ایک زمانہ۔ معدوم ہو جاتا ہے

ہر روز کوئی نیند ٹوٹ جاتی ہے
کوئی آنکھ لگ جاتی ہے
کوئی دل بیٹھ جاتا ہے
اور کوئی زخم بھر جاتا ہے

ایک قصہ ادھورا رہ جاتا ہے
ہر قصے کی طرح
کوئی گیت سو جاتا ہے
کون تان الجھ جاتی ہے
کوئی سانس پھول جاتی ہے
اور خاموشی چھانے سے پہلے
کوئی دھن چھڑ جاتی ہے
انگلیاں چلتی رہتی ہیں
تار ٹوٹتے رہتے ہیں!

ہر روز کوئی بارش تھم جاتی ہے
کوئی زمین سوکھ جاتی ہے
کوئی چولھا سرد ہو جاتا ہے
کوئی بستی اجڑ جاتی ہے
—— کسی تعمیر کے نواح میں
کوئی خوشبو سو جاتی ہے
ایک دریا اپنا رخ تبدیل کر لیتا ہے

اور کناروں پر ایک آگ جل اٹھتی ہے

ہر روز کوئی پھول کھل اٹھتا ہے
کوئی ہوا چل پڑتی ہے
کوئی مٹی اڑ جاتی ہے
اڑ جاتی ہے اور بکھر جاتی ہے
ہونے کی لذت سے سرشار چہروں پر
کوئی کھڑکی بند ہو جاتی ہے
اور کوئی دروازہ کھل جاتا ہے
کھلا رہتا ہے دیر تک

کوئی پہیا رک جاتا ہے
کوئی سواری اتر جاتی ہے
کوئی پتّا ٹوٹ جاتا ہے
کوئی دھول بیٹھ جاتی ہے
اور ایک سفر تمام ہو جاتا ہے
شاخ جھول جاتی ہے

اور کوئی پرندہ اڑ جاتا ہے
ان دیکھی فضاؤں کی جانب
اجنبی گھٹاؤں کی جانب

ہر روز میری آنکھ سے، تمھارے لیے
ایک آنسو۔ گر جاتا ہے
ہونٹوں سے ایک دعا اتر جاتی ہے
دل میں ایک دھاگا ٹوٹ جاتا ہے

اور ایک دن۔ گزر جاتا ہے

دنوں پر دن گرتے چلے جاتے ہیں
گھاس پر سوکھے پتّوں کی طرح
مُٹھّی سے گرتی ریت کی طرح
گزرتے چلے جاتے ہیں
آنکھ سے گزرتے منظروں کی طرح
ہوا میں بہتے بادلوں کی طرح

اور ایک روز ——

موسم گدلا جائیں گے
چہرے ساکت ہو جائیں گے
شور تھم جائے گا
سارے دن
میرے اندر۔ غروب ہو جائیں گے

اور آتے ہوئے روز میں ——
ٹوٹا ہوا قلم
ایک نام کا دھبّا
اور کٹی ہوئی انگلیوں کے نشان رہ جائیں گے!

مَیں گزُرتا ہوں

برسوں کی دوری پر، اطراف میں بارش
بھیگے ہوئے در و بام اور مکین
میں ان سے پوچھتا ہوں
میں ان کی آنکھوں میں دیکھتا ہوں
اور پوچھتا ہوں
"میں کیا کروں؟"

وہ ہنستے ہیں
وہ میرے دل کو زخمی کرتے ہیں
اور قدموں سے
مسافت کی دعا باندھ دیتے ہیں
میں گزرتا ہوں
شاہراہوں اور شور سے
دھول بھری خاموشی کے ساتھ
دلوں اور دریچوں سے
مرجھائی نیند کے ہمراہ
قہقہوں اور آنسوؤں سے
ایک پتھریلی ہنسی کے ساتھ
میں گفتگو سے گزرتا ہوں
اور پھول میرے ہونٹوں پر خشک ہو جاتے ہیں
میں تیری آنکھوں سے گزرتا ہوں
پرچھائیں کی طرح
اور تیرے دل سے
بھولی بسری یاد کی صورت
میں ساحل کو دیکھتا ہوں

سمندر کی آنکھ سے
اور زندگی کو جانتا ہوں
مٹی کے حوالے سے
میں تجھے دیکھتا ہوں
اور گزر جاتا ہوں
میں دنیا سے ایسے گزرتا ہوں
جیسے کوئی نیند سے گزرتا ہے

ہنوز نیند میں ہیں

تم ایک سیاہ گلاب کی طرح کھل اٹھتے ہو
اور تمہاری پتیاں
میرے دل کے آنگن میں
آہستگی سے گرتی رہتی ہیں
میری آنکھ ہی نہیں کھلتی
ریشمی نیندوں والی رات میں

تم ایک گھنے لمس کی صورت
میرے بستر میں گنگنانے لگتے ہو
اور میری آنکھ ہی نہیں کھلتی
عمر کی منڈیروں سے دن
پرندوں کی طرح
ایک ایک کر کے اڑ جاتے ہیں
اور ان کے گرے ہوئے پروں کے ساتھ
ہوا کھیلتی رہتی ہے
وقت اپنا کاہل ماتھا دیواروں سے ملتا رہ جاتا ہے
گلیاں اور مکان
موسموں اور چہروں سے بھر جاتے ہیں
میدانوں میں ہوا سیٹیاں بجاتی ہے
ایک ہاتھ ——
تمہاری لرزتی ہوئی شاخ پر جھک جاتا ہے
بادل، زمین کا ماتھا چوم کر
رو دیتے ہیں
آوازوں کا سیل
میری کنپٹیوں سے ٹکراتا ہے

پلکوں پر دنوں کا نم
بوندوں کی طرح برسنے لگتا ہے
دوریوں کی اوٹ سے
تم، میری جانب دیکھتے ہو
موسموں کی گھنی ردا میں لپٹی ہوئی
اپنی مخروطی انگلیاں
تم، میرے سینے میں گاڑ دیتے ہو
اور میری آنکھ ہی نہیں کھلتی

کچھ پتا نہیں چلتا

آبائی شہر کو جاتی گاڑی کو
دیکھتا ہوں
اس میں سوار نہیں ہوتا
اور نہ ہی ہاتھ ہلاتا ہوں
دنیا۔ عجیب و غریب لوگوں
اور چیزوں سے بھری پڑی ہے

میں بھی بچتا بچاتا
ان میں سے گزرتا ہوں
بغیر کسی یادداشت کے
بغیر کسی خواب کے
ایک دھند ہے
جو دماغ پر جم گئی ہے
ایک رفتار ہے
جو کچھ دیکھنے نہیں دیتی
خالی جگہیں پُر نہیں ہوتیں
لیکن بادل دوڑتے چلے جاتے ہیں
پتھروں اور دیواروں کے درمیان
ہم ـــــ سایوں کی طرح
بھٹکتے پھرتے ہیں
دن ہے یا رات
جیت ہے یا ہار
سفر ہے یا قیام
کچھ پتا نہیں چلتا
بس یوں ہے

کہ جب میرے پانو کو ٹھوکر لگتی ہے
یا میرا ماتھا
اچانک۔ کسی دیوار سے جا ٹکراتا ہے
مجھے لگتا ہے
جیسے کوئی کہتا ہو
"بیٹے ـــــــ میرے بیٹے ـــــــ!"

نظم

موسم سرما کی پہلی شام
نیند اور نورسنگی کی خوشبو میں سوئی ہوئی
گھاس پر۔ دو اجلے قدم
دو نم ناک آنکھیں
اندھیرے میں راستہ بناتی ہوئیں
درختوں میں بھٹکنے لگ جاتی ہیں

چراغ سے زمین کے کناروں تک جل اٹھتے ہیں
دو بازو آسمان کے پہلوؤں تک پھیل جاتے ہیں
اور ایک ہارا ہوا دل
جگہوں کے خالی پن کو
اور بوجھل کر دیتا ہے ——

ایسے میں
کوئی پہیّا سا آپ کے اندر گھوم جاتا ہے
کوئی قدم آپ کے دل پر
عین اس جگہ آپڑتا ہے
جہاں پہلے سے موجود ایک گھاؤ
اس کا منتظر ہوتا ہے

میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ
دن اور رات کے اس تنے ہوئے رسّے پر
کسی کو نیند میں چلتے ہوئے
اپنی جانب آتے —— دیکھ لیا ہے
اور اب میرے دل میں ایک جنگل جھومتا ہے

ہوائیں شور کرتی ہیں
مٹی اڑتی ہے، ہر جانب
میری نیند ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہے
ایک زیادہ گہری نیند کو ——— راستہ دینے کے لیے

موت مجھے بُلاتی ہے

موت مجھے بلاتی ہے
لیکن مجھے وہ شام بھولتی ہی نہیں
جب درختوں میں ہوا چل رہی تھی
میں رک گیا تھا
ایک منظر کے سامنے
گزر جانے کے لیے

اپنی مٹی اور بادلوں کے درمیان
وقت کے بہاؤ کے عین وسط سے
نکل جانے کے لیے
آہستہ آہستہ قدم رکھتے ہوئے
تم میرے دل سے گزرے تھے
یا شاید میں تمھارے دل سے
اور چاندنی ہماری انگلیوں سے الجھ رہی تھی
زمین پر ایسی شام
شاید ہی کہیں اتری ہو
کیفے کی باڑ سے
دنیا ہمیں دیکھتی تھی
پاس بلاتی تھی
اور ہم لوگ لوٹ گئے تھے ——— اپنے اپنے جہنم کو
اذیت اور انکار کی ہر رات
اس شام کی امان میں ہے
وقت کم ہے یا زیادہ
کچھ پتہ نہیں چلتا
میں ایک خواب سے دوسرے خواب میں

اس شام سے گزر کر جانا چاہتا ہوں
تم کہاں ہو؟
موت۔ مجھے بلاتی ہے

اگر مجھے

اگر مجھے خواب ہی دیکھنا تھے
تو میں خواب دیکھتا
آزادی اور محبت کی سمت کھلنے والی کھڑکیوں
اور کشادہ آنگنوں کے
میں نے کیوں
بند دروازوں کے خواب دیکھے

اگر مجھے جاگنا ہی تھا
تو میں جاگ اٹھتا
کسی بادلوں بھری صبح میں
تمہارا ہاتھ تھامے ہوئے
میں نے کیوں
شک اور دکھ سے بھرے
اس گھر میں آنکھ کھول دی

اگر مجھے بکھرنا ہی تھا
تو میں بکھرتا
سمندر کے سینے پر
یا پھر تمہارے قدموں میں
میں نے کیوں
ان بے اماں راستوں میں
اپنی مٹی خراب کی ——؟

اگر مجھے انتظار ہی کرنا تھا
تو میں انتظار کرتا

اس کا۔ جو راستے ڈھونڈتا
میری طرف آنے کے
میں کیوں آنکھوں میں چراغ لیے
اس رہگزار پر بیٹھا رہا
جہاں سے کوئی نہیں گزرتا ؟

اگر مجھے دوڑنا ہی تھا
تو میں دوڑتا چلا جاتا
کسی بھی ناہموار سڑک پر
آنکھیں بند کیے ہوئے
میں کیوں ان دیکھے بھالے راستوں پہ
ٹھوکریں کھاتا پھرا

اگر مجھے رکنا ہی تھا
تو میں رک جاتا
کسی بھی جھیل کے کنارے
اجنبی آسمان کے نیچے
میں کیوں بیٹھ گیا

دنوں کی بے کیفی اور اکتاہٹ کی دہلیز پر

اگر مجھے سونا ہی تھا
تو میں سو رہتا یہیں کہیں
اس بستر پر
یا اپنے مضافات میں کہیں
میں کیوں سو گیا
بے خوابی اور اذیت کے پتھر پر
سر رکھ کر ——

اور

اگر مجھے اتنے بہت سے کام کرنا ہی تھے
تو میں اس دوڑ میں بھی شامل ہو جاتا —— دوسروں کے ساتھ
یا پھر —— دیواروں سے ہی ٹکرا جاتا
انہیں توڑتے ہوئے!

تم ہنستے ہو

تم ہماری دنیا کو دیکھتے ہو
اور ہنستے ہو ——
تمھارے چہرے پر آسودگی ہے
اور سیرابی ——
بہت دنوں کے بعد ایک اجلا دن نکلا ہے
اس دن کے عین وسط میں

تم ـــــ سر کو پیچھے کی جانب پھینکتے ہو
اور ہنستے ہو
تم ہنسی سے کچھ زیادہ ہنستے ہو
سب تمھیں دیکھتے ہیں
پتے تالیاں بجاتے ہیں
ہوا جھوم جھوم چلتی ہے
بادل ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے
آدمی کو توفیق ملے
تو اسے ہنس لینا چاہیے
میرے دل میں بھی جب کوئی سورج اترتا ہے
تو میں بھی ہنستا ہوں
لیکن تمھیں اچھا نہیں لگتا
تمھارے چہرے پر
ملامت اور تاریکی چھا جاتی ہے

کیا میں ہنستا ہوا ـ اچھا نہیں لگتا؟
تم ہنستے ہوئے بہت اچھے لگتے ہو

میرا خیال ہے

دوسروں کی ساری ہنسی بھی

مجھیں۔ ہنس لینی چاہیے

نظم

میں۔ اذیت سے آنسو کشید کرتا ہوں
اور اپنی ہزیمت کے زخم کو
یادوں اور خوابوں کی
ٹوٹی ہوئی انگلیوں سے چھیڑتا رہتا ہوں
داغ مجھے روشنی دکھاتے ہیں
موجود کے دھوئیں سے

میں نے اپنی آنکھیں بھر لی ہیں
اور کچھ دیکھنا نہیں چاہتا
علم۔ بوسیدہ کاغذوں کی صورت
میرے سینے میں اڑتا رہتا ہے
اور دانائی
معمولی آدمی کی پیشانی سے گرتی ہوئی
میرے میلے لباس سے لپٹ جاتی ہے
میں، دیوار کی طرح
اپنی کائی سے کام رکھتا ہوں
اذیت کوشی اور تذلیل نے
میرے دماغ کو ماتھا بنا دیا ہے
اتنا ترس کھا چکا ہوں
کہ میرا جسم بھر گیا ہے
میری نفرت کی گرفت میں
موسموں کے سانس اکھڑ گئے ہیں
میں نے اپنے پانو توڑ لیے ہیں
اور اپنے ہی سائے پر بیٹھ گیا ہوں
اور۔ دنوں کے ملبے سے

ٹوٹے کھلونے اور منہدم زمانے اٹھاتے ہوئے
آتی جاتی ہوا کو
گالیاں دیتا رہتا ہوں
ایک پاگل شور
میرے تعاقب میں ہانپتا چلا آ رہا ہے

نیندوں کے ملبے پر

اور پھر یوں ہوتا ہے
بارش کے پہلے قطرے
چہرے پر گر جاتے ہیں
کھلی چھتوں پر
رات کی تھکاوٹ سے بوجھل چارپائیاں
رسیوں سے باندھ کر

صحنوں میں اتاری جاتی ہیں
کنپٹی پر، آوازوں کی دستک جاگتی ہے
باورچی خانے میں ناشتے کی خوشبو
اور چولھے کی تپش سے دہکتے ہوئے چہرے
اور ماں کا بوسہ ——
باپ کی آواز
تلاوت کرتی ہوئی
سکول تک چھوڑنے آتی ہے
اور تختہ سیاہ پر چاک
عمروں کا حساب کتاب کھینچنے لگ جاتا ہے
تفریح کا وقفہ
ہاتھاپائی۔ اور چھابڑی والوں کی آوازیں
تختیوں پر گاچنی ملتے ہوئے
اچھے بچے بننے کی کوشش
ٹاٹ سے اڑتی گرد
اور پھٹے ہوئے قاعدوں میں
دن۔ ڈوب جاتا ہے
ہم لوٹتے ہیں

اور شام کا لحاف، منہ پر ڈالے
باہر نکل جاتے ہیں
بجھے ہوئے سویروں کی راکھ اڑاتی ہوا
ہر سمت۔ سنسناتی ہے
آبادی سے پرے
ریلوے لائن پر چلتے ہوئے
دونوں طرف خانہ بدوشوں کی جھونپڑیوں سے اٹھتے
دھوئیں کو آنکھوں میں بھرتے ہوئے
ہمارے قدم تیز ہو جاتے ہیں
کانٹے۔ بدل جاتے ہیں

ہم کتنی دور نکل آئے ہیں
سروں پر غیر محفوظ رات چلاتی ہے
اور حافظے کے پچھواڑے
نیندوں کے ملبے پر
عمروں کی بے خوابی سے ٹوٹی ہوئی
چارپائیاں اوندھی پڑی ہیں

خود کلامی

(۱)

تم نے ٹھیک سمجھا
ہر تعلق، ایک ذلت آمیز معاہدہ ہے
تھکے ہارے دلوں کا، اپنے ارادوں کے ساتھ
ہر ربط، ایک مسلسل فریب
ہر لمس، ایک رائگاں سچائی
جس میں سہمے ہوئے جھوٹ سے

ہماری پوریں پناہ مانگتی ہیں
ہاں۔ فراق ایک ابد ہے
تیرے میرے زمانوں کا آخری علاقہ
تیرے میرے امکانات کی آخری سانس
تم نے ٹھیک سمجھا
زندگی' پانیوں میں تیرتے ہوئے جزیرے پر
خودرو گھاس کی طرح
بے معنی اور خوبصورت ہے
تم نے ٹھیک سمجھا
وقت' دلوں سے لپٹ کر
آس اور نراس کا ایک ایک قطرہ نچوڑ ڈالتا ہے
وقت۔ ایک بھاری جاذب ہے
جس میں' میں اور تو
بوندوں کی طرح گرتے رہتے ہیں
تو اور میں
ازل سے ابد تک چلنے والے
ایک مسلسل واہمے کے خال وخد
بوجھل پلکوں سے اس پار کے اندھیارے کو جھٹکتے ہوئے

ایک دوجے کو
صدیوں سے گھورتے چلے آرہے ہیں
تم نے ٹھیک سمجھا
کہ نیند' بے پناہ آغوش کالمس
کہ رات' سب وقتوں کی ایک سچائی
اور صبح کی مقدس روشنی
اس سکوت میں چلنے والے' ایک لمحے کی کروٹ
اس سناٹے میں دراڑ
جو زمان و مکان پر چھائے ہوئے گھنے ابر کی چادر ہے
جس سے ہمارے ناموں کی ڈوریاں بندھی ہیں
ہاں۔ لمحہ صدیوں پر بھاری ہوتا ہے
لمحہ' جو تیری میری آنکھوں کے کھلنے کا جواز ہے
لمحہ' جو عافیت کی بے خودی میں سرشار'
ایک مسلسل رقص ہے
لمحہ' جو تو ہے
لمحہ جو میں ہوں
تم نے ٹھیک سمجھا
کہ سمجھ لینے میں

کبھی نہ ہونے کا خوف ہی ہمارا رشتہ ہے

جو کسی وقت بھی ٹوٹ سکتا ہے

داستان

"قبروں پر دیے بجھ گئے ہیں
اور درختوں میں
ستارے ٹوٹ رہے ہیں
بوسیدہ کواڑوں پر
خاموشی دستک دیتی ہے
اداسی اور محبت سے بوجھل ہوا

سیٹیاں بجاتی ہوئی
زمانوں سے گزر رہی ہے
ان گنت ہاتھ چہار جانب پھیلے ہوئے ہیں
کیلنڈر سے سال
دنوں کی طرح اتر رہے ہیں
آنگنوں میں چارپائیاں اوندھی پڑی ہیں
اور چولھوں میں راکھ
سرد ہو چکی ہے
بچوں کی آنکھوں میں
کھلونے ٹوٹ گئے ہیں
اور دکھتی چھاتیوں میں
شہد خشک ہو گیا ہے
اکھڑتی ہوئی سڑکوں پر
ماتمی جلوس آواز لگاتا ہے
اور' ڈھولک کی تھاپ پر
لڑکیاں وداع کے گیت گا رہی ہیں
نیند کی مہک میں لپٹی ہوئی عمارتوں میں
سانسیں رینگ رہی ہیں

دریچوں میں چاند
تھک کر سو گیا ہے
رات کے کیچڑ میں لت پت گلیاں
جاگ رہی ہیں
وہ سامنے
گلی کے موڑ پر
کانپتے لیمپ کی زرد روشنی میں
ایک سایہ ——— ''

کیا تمہیں نیند آ گئی ہے؟

صحرا پیاسے نہیں

نہیں داخل ہو سکتے تم
کسی بھی مکان میں
مکین کی اجازت کے بغیر
اور ہاتھ نہیں ملا سکتے کسی سے
جب تک وہ خالی اور گرم نہ ہوں
پھر نہیں سکتے

رات دن کے علاقے میں
کوتوال کی اونگھ کے بغیر
چیخ نہیں سکتے
لوگوں کی محفوظ خاموشیوں کے درمیان
اور آنسو نہیں بہا سکتے
کھلے دہانوں کے شور کے بیچ
نہیں کر سکتے نفرت
جب تک تمھارے بازو، مضبوط
اور ارادے
اندھیرے سے بڑھ کر سنگین نہ ہوں
لوٹ نہیں سکتے تم گزشتہ کی جانب
دنوں کی بھیڑ میں راستہ بناتے ہوئے
اور موجود کے ہاتھ جھٹک کر
آیندہ سے بغل گیر نہیں ہو سکتے
تم چوم نہیں سکتے کسی کی آنکھوں کو
نیندوں سے پوچھے بغیر
اور سو نہیں سکتے کسی کے بستر میں
سلوٹوں کی مزاحمت کے بغیر

کر نہیں سکتے تم کار معاش
ذلت اٹھائے بغیر
اور مر نہیں سکتے
موت کے آجانے سے پہلے
تمھارے بادلوں کے لیے
صحرا۔ پیاسے نہیں ہیں
اس آسمان کے نیچے
آزار کے بغیر
تم۔ محبت بھی نہیں کر سکتے

خود کلامی
(۲)

تم نے کبھی سنی
وہ چپ
جو آوازوں کو لپیٹ لیتی ہے
وہ آواز جو درختوں میں گم ہو جاتی ہے
اور وہ چاپ
جو خاک میں مل جاتی ہے

تم کبھی گزرے
اس دن سے
جو نیندوں میں جاگ اٹھتا ہے
اس رات سے
جو کبھی نہیں گزرتی
اس شہر سے
جس کی کوئی حد نہیں
اس ساحل سے
جو لہروں میں اتر جاتا ہے
اور اس آنکھ سے
جو بجھ ہو جاتی ہے
تم نے کبھی سوچا
ان ہونٹوں کے لیے
جن سے نام گر جاتے ہیں
ان قدموں کے لیے
جن سے منزلیں تھکان بن کر لپٹ جاتی ہیں
ان آنگنوں کے لیے
جنہیں ہم۔ اپنی عمروں کے ساتھ

ترک کر دیتے ہیں
تم نے کبھی سوچا
ان جسموں کے لیے جن کی کوئی توجیہہ نہیں
جنہیں وقت ادھیڑ ڈالتا ہے
ان بادلوں کے لیے
جو بے نشاں گزر جاتے ہیں
ان صبحوں کے لیے
جنہیں خوابوں کی دھندلاہٹیں
بوجھل کر دیتی ہیں
ان ناموں کے لیے
جو ان جانی بارشوں میں بھیگ جاتے ہیں
اس ماحصل کے لیے
تم نے کبھی سوچا؟
کبھی احتجاج کیا؟
ہم ——
ہم تو بس، چپ ہو جاتے ہیں

وِچ مِرزا یار پھِرے

لکھ۔ نیند نہیں آتی
اور خواب نظر آتے ہیں
کروٹ لیں تو عمریں ٹوٹ جاتی ہیں
بارشوں میں بھیگے ہوئے دل، نچڑ جاتے ہیں
اور وقت کی دلدل میں
دنیائیں ڈوب جاتی ہیں

لکھ۔
موت کے پچھواڑے سے شہر آواز دیتا ہے
سڑکیں اکھڑ رہی ہیں
اور غلیظ پانیوں میں سانپ بہہ رہے ہیں
مغلظات میں لفظوں کی تہذیب ہے
اور تہذیب میں، سورماؤں کا نطفہ ہے
جابر پٹھوں کا تناؤ ہے
متلی سے عالم کو ثبات ہے
لکھ۔
آنکھیں پھیلی ہوئی پتلیوں میں
منظر انڈیل رہی ہیں
لوگ مرجاتے ہیں
اور ان کے گلے سڑے جسموں سے دھرتی جھومتی ہے
لاشوں کی ہمسائیگی میں
ان کی بند آنکھوں
اور نکلی ہوئی زبانوں سے گرتی رطوبت کے
زہر آلود چھینٹوں میں
پاگل کر دینے والی وحشی صداؤں کا گرداب ہوتا ہے

لکھ،

کھلے دہانوں میں جہنم کی آگ ہے
اور گدلی انتڑیوں میں کیچ کھولتا ہے
سجی ہوئی میزوں پر
حریص معدے الٹ جاتے ہیں
ماتھوں پر دعائیں، داغ بن جاتی ہیں
اور آہنی دانتوں میں
دل چبا دیئے جاتے ہیں
باتوں کی آگ سے ہونٹ سیاہ ہو جاتے ہیں
زخمی ہاتھوں سے پوریں جھڑ جاتی ہیں
بستروں پر بغل گیر تنفس بُو چھوڑ دیتا ہے
کھوپڑیوں میں علوم کے کیڑے
کلبلاتے رہ جاتے ہیں
کوکھ کے اندھیرے، کبھی ساتھ نہیں چھوڑتے

لکھ۔

آنکھیں پھوڑ دی جائیں
اعضا اکھاڑ دیئے جائیں
عمارتیں سروں پر آگریں

دھرتی پھٹ جائے
اور آسمان کو الٹا لٹکا دیا جائے
اور لکھ ——
اور لکھ ——
"گلیاں ہو جان سنجیاں وچ مرزا یار پھرے"

ہم بے وطن ہیں

ہم خواب ہیں
بچپن کی مٹی میں گوندھے ہوئے
جھکی جھکی دیواروں کی باس ہمارا پہناوا ہے
قدیم گلیوں کی چاپ
ہمارے خال و خد کی پہچان ہے
ہم اپنے ہی چہروں پر شکن در شکن پھیل گئے ہیں

ہمارے اندر
شہروں کے نقش بنتے بگڑتے رہتے ہیں
دریچوں سے جھانکتی آنکھیں گواہ ہیں
ہم بے وطن ہیں
کہ جذبوں کے لمس میں سانس لیتے ہیں
ہم بے گھر ہیں
کہ دیواروں کے احاطے میں ہماری طنابیں اکھڑنے
لگتی ہیں
ہم۔ افق تا بہ افق پھیلی ایک گھنیری ردا
ایک بوندیں برساتی دعا کی بدلی ہیں
جو نامراد شہروں، بے اماں آنگنوں
اور گدلائے چہروں پر
کتنی عمروں سے جھکی ہوئی ہے
ہمیشگی، ہمارا وہم ہے
اور فنا، ہمارے مقدر کی پرچھائیں
ہمارے ہونے میں
ہمارے نہ ہونے کی ساری عمر چھپی ہوئی ہے
ہم خواب ہیں
جو اپنے لیے بھی ان دیکھے ہیں

ہر رات سے گزرنے کے لیے

ہر رات سے گزرنے کے لیے
ایک چاند کی خنک روشنی درکار ہوتی ہے
تاریکی اور اجالے کے مابین
جگمگاتی انگلیوں کی دھارائیں
سینے میں اتر جانے سے ہی
کوئی صورت بن سکتی ہے

وہ کپکپی، دو ہاتھوں کے درمیان
اپنی ہی ہیبت میں سہمے ہوئے
موسم کی طرح ٹھہر گئی ہے
تیری پتلیوں میں دو بے چین پرندوں کی پھڑپھڑاہٹ
میری سانسوں میں بھر گئی ہے
تیرے زمانے
میری آنکھوں میں خواب بن کر پھیلتے جا رہے ہیں
میرے ہونٹوں سے
تیرے نام کے حروف لپٹ گئے ہیں
اور انہیں۔ قدموں کے نیچے کی زمین پر
پپڑیوں کی صورت گرتے ہوئے
دیکھنے سے میں، پناہ مانگتا ہوں
صدیوں کے بے انت پانیوں کی تھکن
میرے اعضاء کا اضمحلال ہے
میرے ریشوں میں ایک بے پناہ لمس کی توفیق
اپنی طنابیں کھینچ رہی ہے
اور تیری اجلی نیندوں والی گود
میری خواب گاہ کا خواب ہے

تیرے سفید بستر کے سرہانے کھڑا
میں، ایک سیاہ پوش ہم نفس ہوں
جو تیری پیشانی کو
اپنے ہونٹوں کی سیاہی سے
آلودہ کرنا چاہتا ہے
میں، تیرے آنگن میں اترتی شام کے لحاف میں
ماہ و سال چھپا کر
سو جانا چاہتا ہوں
موسموں کے سانس اکھڑ جانے سے پہلے
دھند میں گم ہو جانے سے پہلے
تیری گھنیری شاخوں سے لپٹ کر
دل کھول کر، رو لینا چاہتا ہوں
اور ایسے موسموں کے بیچ
ہونے، نہ ہونے کے آس پاس
میں۔ تیری دہلیز پر
سیٹیاں بجاتی، سسکاریاں لیتی ہوئی
ہوا کی، ایک مسلسل دستک ہوں
جو تیری سماعت کو بھر دینے کے لیے
بے چین ہے

لمحے کا منظر نامہ

بوندوں کی ٹپ ٹپ میں
کوئی نام کب تک رو سکتا ہے
موسموں سے
کوئی کب تک ہاتھ ملا سکتا ہے
وقت سے
کوئی کب تک الجھ سکتا ہے

ٹوٹی ہوئی کشتی سے
سمندر کے سینے میں کہرام نہیں مچایا جا سکتا
سانسوں کے لنگر گرا دینے سے
لہروں کے سامنے ٹھہرا نہیں جا سکتا
کسی ایک کمرے میں
چند آنسوؤں کے شور سے
دنیا کو متوجہ نہیں کیا جا سکتا
کائنات کو ہلایا نہیں جا سکتا
ویسے بھی
اتنے بڑے کینوس پر
کوئی ایک دھبا ـــــ آخر کتنا پھیل سکتا ہے

پیش لفظ

پھول۔ خوشبو اور رنگت کے مٹتے خوابوں
راستے۔ قدموں کے اضمحلال اور لاحاصلی کی دھول
خوشبو۔ کسی بھولے ہوئے چہرے کی اداسی
اور رنگ
ایک ملگجے اندھیرے میں
آنکھوں کی پسپائی کے سوا

ہمیں کیا دیتے ہیں؟
رات۔ ابدی سناٹے کے لمس
بستر۔ ادھڑتی دیواروں سے گرتی مٹی
شور۔ ہونٹوں کی گم شدگی
اور لوگ
غصیلی آوازوں کی بیچارگی کے سوا
قافلے۔ ممنوعہ سمتوں اور گرے ہوئے آنسووں
اور فاصلے
وسعت کی دائمی چپ کے سوا
عمریں۔ رگوں میں بجھتے دنوں کی راکھ
رات اور دن۔ تمھارے دیئے ہوئے خوابوں اور
دلاسوں
کتاب۔ متواتر پسپائیوں اور ذلتوں کے بیان
اور علوم
لاعلمی کے مسلسل انکار کے سوا
ہمیں کیا دیتے ہیں
اور تم۔ صدیوں کے دوش سے اترتے ہوئے
فراق کے ابد کا گیت گاتے ہوئے

عمروں کی خاموشی میں
ہماری آنکھوں کو لپیٹتے ہوئے
ہمیں لفظوں کے حوالے کر جاتے ہو
اور لفظ
لایعنی معنویت کے سوا
ہمیں کیا دیتے ہیں؟



ہر آخری دن سے پہلے ایک اور آخری دن بھی ہوتا ہے اور وہ ہوتا ہے آج کا دن۔ اِسے حال بھی کہتے ہیں۔ حال ہی وہ گریزاں حقیقت ہے جس میں مقدّر اور تقدیر ایک وحدت میں ڈھلتے ہیں۔ جس نے حال کو پالیا اُس نے مقدّر (DESTINY) اور تقدیر (FATE) پر کمند ڈال لی اور صاحبِ حال کہلایا۔ سچّے صُوفی کی طرح سچّا شاعر بھی صاحبِ حال ہوتا ہے۔ اس کے لمحۂ حال میں ماضی اور مستقبل، زمانِ مسلسل اور زمانِ خالص، اَزل اور ابد، بلکہ عرصۂ محشر بھی منعکس ہوتے رہتے ہیں۔ پھر جب اظہار کا دریا چڑھتا ہے تو وہ حال کے اِس لمحے کو شاعر کے وجود کے کٹے پھٹے ساحلوں سے اُٹھا کر دوام کے اتھاہ سمندر میں لے جا گراتا ہے۔ ابرار احمد کی نظمیں حال اور دوام کے سنگھم پر کھڑے کھڑے ایک عالمِ حیرت میں لکھی گئی ہیں۔

ظاہر میں پھیلی زندگی کو کھُلی آنکھوں سے دیکھنا بھی کسی کسی کو میسّر آتا ہے۔ پھر اپنے باطن میں اُترنا اور اس کی تہہ سے کچھ متاعِ معنی خیز نکال کر دُوسروں کی نذر کرنا تو اور بھی کمیاب ہے۔ لیکن ابرار احمد نے محض نظر اور نیند کے سہارے ظاہر اور باطن کی ہی سیاحی نہیں کی، اس نے خیال کو خواب سے ملا کر انسانی واردات کے حوالے سے عدم اور امکان کی سرزمینیں بھی کھنگال ڈالی ہیں۔ ہونے اور نہ ہونے کا وہ سوال جس نے شیکسپئر سے غالب تک ہر بڑے شاعر کو پریشان رکھا ابرار احمد کو بھی درپیش ہے، خاص طور پر ہونے کا درد اس کے ہاں بہت شدید ہے۔ بے شک ہونے کی سرخوشی بھی کہیں کہیں سر اُٹھاتی ہے لیکن اس سرخوشی کے ساتھ ساتھ اسے وہ معذوری، ذلّت، ہزیمت، ابتری اور بے معنویت بھی یاد رہتی ہے جس سے آج کی انسانی حالت (HUMAN CONDITION) عبارت ہے اور جس نے اس کی نیند اور خوابوں کو داغدار کر کے رکھ دیا ہے۔ اس کی نظمیں سوتے جاگتے کا ایک نیا قصہ ہیں۔ سوتے سوتے اور جاگتے جاگتے وہ جس خُود کلامی میں محو رہتا ہے وہ اس کی نظموں کا مواد ہے۔ یہ نظمیں اُداسی کی ایک ایسی دبیز لیکن شفاف چادر میں لپٹی ہیں جس کے اندر سے ہم ابرار احمد ہی نہیں اپنے عہد اور اپنی نسل کے نصیب میں لکھے زندگی کے تمام تر درد کو کارفرما دیکھ سکتے ہیں۔

محمد حنیف رامے